جلد ۸۲ ستمبر ۱۹۷۴ء عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۱	ستمبر ۱۹۷۴ء مطابق شعبان ۱۳۹۴ھ	جلد ۸۲

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

زرِ سالانہ بارہ روپے - فی پرچہ ۱/۲۵ روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ترجمان القرآن کے گذشتہ شمارے میں ہم نے مذہب اور سیاست کی دوئی اور اس کے منطقی مغالطوں پر بحث کی تھی۔ اس بحث کا ہماری توقع کے عین مطابق مختلف حلقوں میں مختلف ردعمل ہوا ہے اور اس سلسلے میں ہمیں متعدد خطوط ملے ہیں جن میں بعض کا لب ولہجہ انتہائی تند و تیز ہے اور ہماری ان گزارشات کو ایک خاص گروہ پر بے جا حملہ تصور کیا گیا ہے۔ البتہ ان خطوط میں ایک دو خط ایسے بھی ہیں جن میں زبان اگرچہ سخت استعمال کی گئی ہے لیکن ان کے انداز تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والے حقیقت کو سمجھنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ ہم ان خطوط میں سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔

”میں عرصہ سے ترجمان القرآن کا مطالعہ کر رہا ہوں لیکن ایک چیز جو مجھے اور مجھ جیسے ہزاروں آدمیوں پر شاق گزرتی ہے وہ آپ لوگوں کی ”سیاست بازی“ ہے۔ آپ کے پیش نظر صرف ایک ہی مقصد ہے کہ کسی طرح حکومت پر قبضہ کر لیا جائے۔ یہ اللہ کے دین کی کونسی خدمت ہے۔ آپ کی جماعت ایک سیاسی جماعت ہے مگر اس نے بڑی چالاکی سے اپنے اُوپر مذہب کا لیبل چپکا رکھا ہے۔ کیا ہمارے وہ سارے بزرگ اسلام سے ناواقف اور نابلد تھے جو سیاست سے کنارہ کش رہ کر لوگوں کا تزکیۂ نفس کرتے اور انہیں خدا اور رسول کی اطاعت گزاری کا سبق دیتے تھے۔ سیاست کی باتیں یوں تو آپ کم و بیش ہر شمارے میں کرتے رہتے ہیں لیکن اب کی مرتبہ آپ نے ان لوگوں پر سخت چوٹ کی ہے جو آپ کے غلط مسلک سے اتفاق نہیں رکھتے اور سیاست کی گندی وادی میں قدم رکھے بغیر مسلمانوں کی مذہبی زندگی کو درست کرنے کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں۔ چلیئے ہم ایک لمحہ کے لیے یہ بات تسلیم کر لیتے ہیں کہ سیاست بھی اسلام کا

ایک حد تک وجہ ہے دگرچہ میرا ذہن اس بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا کہ مکر و فریب کا یہ دھندا اسلام جیسے پاکیزہ دین کا کوئی حصہ ہوسکتا ہے) تو کیا یہ بھی ضروری ہے کہ ہم تعمیری تنقید کے ذریعہ حکمرانوں کی اصلاح کرنے کے بجائے ان سے تخت اقتدار چھیننے کے لیے پنجہ آزمائی کرتے رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ حصول اقتدار کی خواہش ترک کر کے حکمرانوں کو وعظ و نصیحت کے ذریعے راہ راست پہ لانے کی کوشش کریں تو وہ کوشش زیادہ مؤثر اور کامیاب ہوگی اور باہمی آویزش بھی ختم ہو جائے گی۔ مگر آپ یہ سیدھا اور معقول راستہ اختیار کرنے کے بجائے ہر صاحبِ اقتدار سے اُلجھتے رہتے ہیں۔ مولانا مودودی کی علمیت کا ہر شخص معترف ہے۔ اور مجھے قوی اُمید ہے کہ اگر وہ حکمرانوں کے مقابلے میں حکمرانی کا دعویٰ ترک کر دیں اور اُن کی اصلاح کی کوشش کریں تو تمام حکمران انہیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیں گے اور ان کی بیشتر باتوں کو توجہ سے سننے پر آمادہ ہو جائیں گے مگر آپ لوگ اپنی تحریروں اور بیان بازیوں سے برسرِ اقتدار طبقوں کے اندر چڑ پیدا کر رہے ہیں۔

سیاست و اقتدار زندگی کے متعدد شعبوں میں سے بس ایک شعبہ ہے۔ اگر دوسرے شعبوں کی اصلاح ہو جائے تو یہ شعبہ پھر خود بخود درست ہو جائے گا۔ فرض کیجیے ہمارے پاس دس پیکٹ ہیں جن کی صفائی ہمیں مطلوب ہے۔ ان میں سے ایک پیکٹ کے اندر سیاست بھری ہوئی ہے۔ آخر یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ صرف ایک پیکٹ کو درست کرنے میں سارا وقت ضائع کر دیا جائے۔ کیا صحیح طرزِ عمل یہ نہیں کہ پہلے نو پیکٹ ہر قسم کی آلائشوں سے صاف کر لیے جائیں، پھر دسویں پیکٹ کی طرف توجہ دی جائے اور اگر وہ حسبِ منشا صاف نہ بھی کیا جا سکے تو پھر اُسے یونہی رہنے دیا جائے۔"

ہم نے دو تین خطوط کے یہ مندرجات طوالت کے احساس کے باوجود اس لیے یہاں درج کیے ہیں کہ اسلام کے جسدِ اطہر سے سیاست کی آلائش کو الگ رکھنے کے لیے الفاظ کے تھوڑے بہت اختلاف کے باوجود قریب قریب یہی دلائل اور یہی اسلوبِ بیان اختیار کیا جاتا ہے۔ ان دلائل کے بارے میں ہم اپنی گزارشات کا آغاز اِن خطوط کے آخری حصے سے کرتے ہیں کیونکہ ہمارے نزدیک یہی وہ بنیادی غلط فہمی ہے جس میں

مبتلا ہونے کی وجہ سے لوگ دین کو سیاست سے الگ رکھنے پر مصر ہوتے ہیں۔ اس طرزِ استدلال کی سب سے نمایاں خامی یہ ہے کہ حیاتِ انسانی کے کسی ایک شعبے کو ایک پیکٹ پر قیاس کر کے ایک غلط نظریہ گھڑ لیا گیا ہے اور یہ قیاس تو خود قیاس مع الفارق ہے۔ آپ اگر ایک پیکٹ کے اندر ایک چیز بھر دیں تو دوسرے پیکٹ کی کوئی چیز خود بخود اس میں گھس نہیں سکتی لیکن انسانی زندگی کا ہر شعبہ دوسرے شعبے کے ساتھ اس قدر مربوط ہوتا ہے کہ بسا اوقات ان کے درمیان کوئی حد فاصل قائم کرنا ممکن نہیں ہوتا، مثلاً آپ شعبہ تجارت اور قانون کے درمیان، یا شعبہ قانون اور اخلاق کے درمیان یا تعلیم اور ثقافت کے درمیان یا نظم و نسق اور تہذیب نفس کے درمیان کوئی حد بندی نہیں کر سکتے۔ زندگی کے ان شعبوں کا آپس میں ربط و ضبط اس قدر قریبی ہے کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کو یہ نہیں کہہ سکتا۔

من دیگرم تو دیگری

ظاہر بات ہے کہ جہاں ایک شعبے کا دوسرے شعبوں سے تعلق اس قدر گہرا ہو وہاں انہیں الگ الگ ڈبوں کی صورت میں ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ ایک دوسرے پر نہایت گہرے اثرات مترتب کرنے کی وجہ سے آپس میں اس قدر ہم رنگ اور ہم آہنگ ہوتے ہیں کہ ان کے مابین تمیز کرنی مشکل ہو جاتی ہے۔ حیاتِ انسانی کے متعدد شعبوں کو نہ تو مختلف اشیاء کے بکھرے ہوئے پیکٹوں پر قیاس کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی ملک کے اندر پائے جانے والے جوہڑوں اور تالابوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے کہ پہلے کسی دوسرے سے تعرض کیے بغیر ایک کو صاف کر لیا جائے اور پھر دوسرے کی طرف توجہ دی جائے۔ زندگی کا دھارا دریا کے بہاؤ کی حیثیت رکھتا ہے جو زندگی کی پوری گزرگاہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے چنانچہ آپ دریا کے بہاؤ کے بارے میں اس بات کا تعین تو کر سکتے ہیں کہ اب یہ پہاڑی علاقے میں سے گذر رہا ہے اور اب میدانی علاقے میں داخل ہو رہا ہے اور پہاڑی علاقے میں سے گذرتے ہوئے اس کے اندر اس نوعیت کی کثافتیں شامل ہوئی ہیں اور میدانی علاقے میں گذرتے ہوئے دوسری نوعیت کی غلاظتیں اس کی سطح پر تیرنے لگی ہیں، مگر آپ اس کے دھارے کے کسی مخصوص حصے کو بہاؤ سے الگ کر کے صاف نہیں کر سکتے۔ آپ کو اگر اس کی صفائی مطلوب ہے تو پورے دھارے کی فکر کرنا ہو گی۔

جو لوگ زندگی کے مختلف شعبوں کو اشیاء کے پیکٹوں کے مشابہ سمجھ کر اس پر کوئی حکم لگاتے ہیں

ان کے بارے میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ حیات انسانی کی ابجد تک سے ناواقف ہیں۔ بے جان اشیاء کے چھوٹے چھوٹے تھیلوں کو رواں دواں اور متحرک زندگی کے مختلف شعبوں پر قیاس کرنا انتہائی سادگی ہے، ایسی سادگی جس کے ڈانڈے بیوقوفی سے ملتے نظر آتے ہیں۔

پھر اس انداز پر سوچنے والے لوگ دوسری بڑی غلطی یہ کرتے ہیں کہ ان پیکٹوں کے بارے میں بھی فرض کر لیتے ہیں کہ زندگی کے یہ پیکٹ مختلف مقامات پر بکھرے پڑے رہتے ہیں اور کوئی قوت انہیں نظم اور ترتیب کے ساتھ ایک دوسرے سے وابستہ کرنے والی نہیں ہوتی۔ یہ ایک انتہائی غلط مفروضہ ہے جس پر مذہب اور سیاست کی دوئی کا نظریہ قائم کیا گیا ہے۔ اگر حیات انسانی مختلف پیکٹوں سے عبارت ہے تو پھر بھی ایک ایسی قوت کا وجود ناگزیر ہے جو ان پیکٹوں کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ باہم جوڑ کر رکھے۔ زندگی کے منتشر اور بکھرے ہوئے شعبے کسی نظم اجتماعی کو آخر کس طرح جنم دے سکتے ہیں؟ اگر زندگی کے مختلف شعبوں کو پیکٹوں ہی پر قیاس کرنا ہے تو پھر اس تار کی قوت اور اس کی بالادستی اور افادیت کو بھی نگاہ میں رکھیے جو ان پیکٹوں کے گرد لپیٹ کر نہ صرف خاص ترتیب کے ساتھ انہیں ایک دوسرے سے پیوست رکھتی ہے بلکہ ان کے تحفظ کا سامان بھی بہم پہنچاتی ہے۔ یہ تار حکومت کی قوت ہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی خاص پیکٹ کی صفائی کا طالب ہے تو وہ جب تک تار سے اُلجھ کر اور اس کی گرفت کمزور کر کے اپنے دل پسند پیکٹ کو دوسرے پیکٹوں سے الگ کر کے اُسے اپنے قبضہ اختیار میں نہیں لے آتا وہ اس کے صاف کرنے پر کس طرح قادر ہو سکتا ہے۔ آپ اگر کسی مظلوم کو ظلم سے نجات دلانے کی تڑپ رکھتے ہیں تو اس کے لیے بنیادی ضرورت یہ ہے کہ سب سے پہلے اُسے اس پنجہ استبداد سے رہائی دلانے کی کوشش کریں جس کی جکڑبندی میں وہ مظلوم کراہ رہا ہے۔ محض وعظ و نصیحت اور نیکی کی تلقین سے تو مظلوم کے دکھوں کا کوئی مداوا نہیں ہو سکتا۔ بالفرض آپ اگر خود اس سلسلے میں کچھ کرنے سے عاجز ہوں اور اپنی کوششوں کو صرف مظلوم کا حوصلہ بڑھانے تک محدود رکھنا چاہتے ہوں تو پھر بھی اصلاح کی واحد صورت یہی ہو گی کہ مظلوم سب سے پہلے اپنے آپ کو ظالم کے پنجے سے نجات دلانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے اور اس سے آزاد ہونے کی کوشش کرے۔ کیونکہ وہ جب تک اُس سے رہائی حاصل نہیں کر لیتا یا کم از کم اس پنجے کی گرفت کو ڈھیلا کرنے کا انتظام نہیں کر پاتا، اُس وقت تک وہ آپ کے نیک مشوروں کی روشنی میں اپنی اصلاح کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ پنجۂ استبداد سے رہائی اصلاح احوال کی بنیادی ضرورت ہے اور

آپ اُسے سیاست بازی کا مکروہ کھیل سمجھ کر اس سے دامن بچانے کا پرچار کرتے ہیں۔

دنیا کا ہر نظام زندگی کے مختلف شعبوں کو ایک دوسرے سے مربوط رکھنے کے لیے انھیں اپنی مخصوص جکڑ بندیوں میں پوری طرح کس کر رکھتا ہے کیونکہ اس کے حفظ و بقا کا سارا انحصار اسی پر ہوتا ہے اور جو شعبہ حیات یہ فرض سرانجام دیتا ہے وہ سیاست و اقتدار ہے۔ اب اگر آپ ان جکڑ بندیوں سے تو کوئی تعرض نہیں کرتے اور زندگی کے بعض دوسرے شعبے جو ان کی آہنی گرفت میں ہیں اُن میں اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو خود ہی غور فرمائیں کیا آپ کی یہ مقدس خواہش کبھی پوری ہو سکتی ہے؟ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ بعض نیک افراد اور گروہوں نے اپنے کام کا آغاز اس انداز سے کیا کہ جیسے اُن کا سیاست سے کوئی دُور کا بھی تعلق نہ تھا لیکن جونہی وہ چند قدم آگے بڑھے اور اُن کے پیغام نے عوام کے اندر حرکت و حرارت پیدا کی تو سیاست کے معاملے میں ان حضرات کی ساری احتیاطی تدابیر کے باوجود اربابِ اختیار نے اُنھیں اور اُن کے کام کو اپنے لیے خطرہ ہی سمجھا۔ انھوں نے جب ان حضرات کی سرگرمیوں کو بڑھتے ہوئے دیکھا اور انھیں اس امر کا احساس ہوا کہ یہ لوگ کسی شعبہ زندگی میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو وہ فوراً اس بات کو بھانپ گئے کہ ان سرگرمیوں کی زد ان جکڑ بندیوں پر پڑنے والی ہے جن میں انھوں نے عوام کو جکڑ رکھا ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے ان "غیر سیاسی سرگرمیوں" کو بھی اسی طرح کچلنے کی کوشش کی جس طرح کہ سیاسی تحریکات کو کچلا جاتا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے جو لوگ ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لیے لوگوں کی گردنوں پر مُسلط ہوں وہ آخر کس طرح گوارا کر سکتے ہیں کہ کوئی فرد یا جماعت کوئی ایسی تحریک یا پروگرام لے کر اُٹھے جو اصحابِ اقتدار کی گرفت کے لیے اپنے اندر کوئی چیلنج رکھتی ہو۔

تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ آج تک دنیا میں جتنے بھی ہادی اور رہنما آئے ہیں ان کی اقتدار سے براہِ راست ٹکر ہوئی یا نہ ہوئی مگر اقتدار نے ان مُصلحین کو اپنے لیے ہمیشہ شدید خطرہ ہی خیال کیا اور پوری قوت سے اُن کا راستہ روکنے کی کوشش کی کیونکہ اصحابِ اقتدار کو اس بات کا اچھی طرح علم تھا کہ ان حضرات کی اصلاحی سرگرمیاں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتیں جب تک اس نظام کی قوت درہم برہم نہیں ہو جاتی جو انھوں نے عوام پر مسلط کر رکھا ہے۔ غیر سیاسی سرگرمیوں تک اپنے آپ کو محدود رکھ کر اگر کوئی انقلاب لانا ممکن ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون سے پنجہ آزمائی کر کے بنی اسرائیل کو اس کی غلامی

سے نجات دلانے کی کبھی کوشش نہ کرتے۔ وہ سیاست سے کنارہ کش رہ کر بڑی خاموشی کے ساتھ دعوت و تبلیغ کا کام کرتے۔ مگر اس عارف ربانی کے سامنے یہ حقیقت پوری طرح واضح تھی کہ جس طرح دو تلواریں ایک نیام میں نہیں سما سکتیں اسی طرح دو نظامہائے حیات ایک وقت میں غالب نہیں ہو سکتے۔ حق کو اگر غالب اور سربلند ہونا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ باطل سرنگوں ہو یا کم از کم جو لوگ حق کا نفاذ چاہتے ہیں وہ باطل کی عملداری سے نکل جائیں۔

سطح بین لوگوں کی نظر میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تعلیمات اور اُن کی دعوتی سرگرمیوں سے زیادہ غیر سیاسی تعلیمات اور سرگرمیاں کس کی ہو سکتی ہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اقتدار نے ان کے اندر بھی اسی نوعیت کا شدید خطرہ محسوس کیا جو فرعون نے حضرت موسٰی علیہ السلام کی تعلیمات اور سرگرمیوں کے اندر محسوس کیا تھا اور اس مُخبر صادق علیہ السلام کی ساری نیکی، پرہیزگاری، دنیا اور اس کے معاملات سے بظاہر لاتعلقی کے باوجود اُس کے لیے وہ سزا تجویز کی جو اس دنیائے فانی میں کسی انسان کے لیے سب سے زیادہ سنگین سزا تجویز کی جا سکتی ہے۔ اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو وعظ و نصیحت تک محدود رکھنے کے باوجود انہیں موت کا حکم سُنایا گیا۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کیا تھی کہ رائج الوقت نظام کے حامیوں کو اس بات کا خطرہ لاحق تھا کہ دعوت و تبلیغ کا یہ "خاموش اور بظاہر بے ضرر سا پروگرام" اگر عوام کی توجہ کا مرکز بن گیا اور ان کے اندر اس پروگرام کے مطابق اصلاح احوال کی تحریک پیدا ہوئی تو اس سے ایوان اقتدار میں لازمی طور پر تزلزل پیدا ہوگا جو بالآخر اُسے پیوند خاک کر دے گا۔

کلمہ طیبہ سے زیادہ روحانی کلمہ اور کونسا ہو سکتا ہے جو صرف اللہ رب العزت کی یکتائی و کبریائی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے ذکر سے عبارت ہے۔ اس میں سیاست کا کوئی شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ پھر اس میں بظاہر کوئی ایسا اشارہ بھی نہیں ملتا جس سے کسی حکمران سے اس کا تخت و تاج چھیننے کا کوئی اندیشہ موجود ہو مگر اس کے باوجود اس مختصر سے کلمے کو جس میں کائنات کی دو بنیادی حقیقتوں کے اعتراف کے علاوہ اور کسی چیز کا تذکرہ نہیں، سنتے ہی نہ صرف قریش کے سربراہ بلکہ پوری دنیا کے تاجدار تلملا اُٹھے اور عرب کے قبائلی سرداروں سے لے کر روم اور ایران کے قیاصرہ اور اکاسرہ تک سب نے اسے اپنی موت کا پیغام سمجھتے

ہوئے اسے دباتے اور اس پر ایمان لانے والوں کو مٹانے کی کوشش کی۔ قریش کے سردار، یہودیوں اور عیسائیوں
مذہبی رہنما، روم اور ایران کے حکمران، چین اور منگول کے خاقان و فغفور آخر دیوانے تو نہیں ہو گئے تھے کہ
وہ اس "غیر سیاسی کلمے" کو سنتے ہی بلاوجہ اشتعال میں آجاتے اور اس کلمہ کے علمبرداروں کی مختصر سی جماعت،
جو ان کے اپنے بھائی بندوں پر ہی مشتمل تھی، اسے پوری قوت سے مٹانے لگتے۔ اگر اس کلمہ میں عرب و عجم کے قائدین
کی قیادت اور سیادت کے لیے کوئی خطرات مضمر نہ تھے تو انہیں اپنے بھائیوں پر دستِ ظلم دراز کرنے کی ضرورت
آخر کیوں پیش آئی؟ وجہ صاف ظاہر ہے کہ وہ اس کلمے کے فکری اور عملی مضمرات سے اچھی طرح واقف تھے۔
انھیں اس بات کا پوری طرح علم تھا کہ یہ کلمہ جس ہمہ گیر انقلاب کی دعوت دے رہا ہے اس سے باطل کی سرزمین
ناگزیر طور پر زیروزبر ہونے والی ہے۔ اللہ کی کبریائی کا اظہار کوئی منطقی مفروضہ نہیں بلکہ یہ اس حقیقت کا اعلان
ہے کہ سروری صرف اسی ذات بے ہمتا کو زیب دیتی ہے جو اس کائنات کی واحد خالق، مالک اور مدبر ہے
اور اس ایک ذات کے علاوہ کبریائی کے سارے دعویدار بتان آذری کی حیثیت رکھتے ہیں جنھیں پاش پاش
کیے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ پھر رسالتِ محمدیؐ کا اقرار کسی عظیم انسان کی عظمت کا اعتراف ہی نہیں بلکہ یہ اس
حقیقت کا پورے جزم و یقین کے ساتھ اقرار ہے کہ آج کے بعد دنیا میں حق کا واحد منبع و سرچشمہ محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور ان کا مقدس پیغام ہے۔ حضورؐ کے ارشادات و فرمودات اور حضورؐ کے
افعال و اعمال کی روشنی ہی میں نوع انسانی کو حق و باطل کے درمیان تمیز کرنا ہوگی۔ جس بات کو حضور صلی اللہ
علیہ وسلم نے حق قرار دے دیا ہے وہ قیامت تک حق ہی رہے گی اور جس کے باطل ہونے پر آپؐ نے حکم لگا دیا
وہ باطل ہی رہے گی خواہ سارے انسان بھی مل کر اسے حق ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہیں۔ حضورؐ کا قول زندگی
کے ہر معاملے میں انفرادی ہو یا اجتماعی قول فیصل کی حیثیت رکھے گا اور حضورؐ کا عمل وہ آخری اور قطعی معیارِ
حق ہوگا جسے پیش نظر رکھ کر بنی نوع انسان اپنے اعمال کو پرکھا اور جانچا کرے گی۔

کلمہ طیبہ کے اس انتہائی فکر انگیز اور ہمہ گیر انقلابی پیغام کو سننے کے بعد اگر باطل اور اس کے پرستار خوفزدہ
ہو کر حق کا راستہ روکنے کی جدوجہد نہ کرتے تو کیا کرتے؟ انہیں اپنے تحفظ کے لیے حق کے خلاف صف آرا
ہونا ہی تھا اور حق کو اپنی راہ ہموار کرنے کے لیے باطل سے لازمی طور پر ٹکرانا ہی تھا۔ اگر حق و باطل فی الحقیقت
ایک دوسرے کی ضد ہیں تو ان کے مابین تصادم ناگزیر ہے۔ اگر یہ تصادم کچھ مدت کے لیے ٹلتا نظر آتا ہے

(باقی بر صفحہ ۴۶)

فصل دوم

رسالتِ محمدیؐ پر ایمان کی دعوت

(۳)

اعتراضات، الزامات اور عجیب عجیب مطالبات

اس دُہری مشکل سے دوچار ہونے کے بعد قریش اور دوسرے مشرکین کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہ رہا کہ حضورؐ کی رسالت کو نہ ماننے کے لیے طرح طرح کے اعتراضات کریں، مختلف اور متضاد الزامات آپ پر لگائیں، اور عجیب عجیب معجزات دکھانے کا آپ سے مطالبہ کریں۔ لیکن جیسا کہ توحید کے معاملہ میں آپ نے دیکھا کہ شرک کی تردید اور وحدانیتِ خداوندی کے اثبات کے لیے ایسے زبردست دلائل پیش کیے گئے جن سے کسی معقول آدمی کے لیے اِن حقائق کا انکار کرنے کی گنجائش نہیں رہی، ٹھیک اسی طرح رسالت کے خلاف بھی مشرکین کے اِن تمام حربوں کا مقابلہ ایسے مدلّل طریقہ سے کیا گیا کہ جس کے دماغ میں بھی کچھ عقل تھی وہ دل میں قائل ہوئے بغیر نہ رہ سکا، خواہ ضد اور ہٹ دھرمی سے وہ مخالفت کرتا رہے۔

حضورؐ کے انسان ہونے پر اعتراض

ان کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ ہم ایک ایسے شخص کو خدا کا رسول کیسے مان لیں جو ہماری ہی طرح کا ایک انسان ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، بال بچے رکھتا ہے، اور دنیاداری کے وہ سب کام کرتا ہے جو دوسرے انسان کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اُن کے اس اعتراض کو نقل کر کے مختلف مقامات پر اس کے جوابات دیئے گئے۔

وَأَسَرُّوا النَّجْوَى ۖ الَّذِينَ ظَلَمُوا ۖ هَلْ هَٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۖ أَفَتَأْتُونَ السِّحْرَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ ۔
(الانبیاء۔ ۳)

اور یہ ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص آخر تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے، پھر کیا تم آنکھوں دیکھتے جادو کے پھندے میں پھنس جاؤ گے۔

یہ سرگوشیاں کفارِ مکہ کے وہ بڑے بڑے سردار آپس میں بیٹھ بیٹھ کر کیا کرتے تھے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مقابلہ کرنے کی بڑی فکر لاحق تھی۔ وہ کہتے تھے کہ "یہ شخص بہر حال نبی تو ہو نہیں سکتا، کیونکہ ہم ہی جیسا انسان ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے۔ آخر اس میں وہ نرالی بات کیا ہے جو اس کو ہم سے ممتاز کرتی ہو اور ہماری بہ نسبت اِس کو خدا سے ایک غیر معمولی تعلق کا مستحق بناتی ہو؟ البتہ اس شخص کی باتوں میں اور اس کی شخصیت میں ایک جادو ہے کہ جو اس کی بات کان لگا کر سنتا ہے اور اس کے قریب جاتا ہے وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو نہ اس کی سنو اور نہ اس سے میل جول رکھو، کیونکہ اس کی باتیں سننا اور اس کے قریب جانا گویا آنکھوں دیکھتے جادو کے پھندے میں پھنسنا ہے۔"

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ - لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۝ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا -

(الفرقان ۷-۸)

اور وہ کہتے ہیں" یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟ کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں کو) دھمکاتا؟ یا اور کچھ نہیں تو اس کے لیے کوئی خزانہ ہی اُتار دیا گیا ہوتا، یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ (اطمینان کی) روزی حاصل کرتا۔" اور ظالم کہتے ہیں "تم لوگ تو ایک سحر زدہ آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو۔"

اُن کا مطلب یہ تھا کہ اوّل تو انسان کا رسول ہونا ہی عجیب بات ہے۔ خدا کا پیغام لے کر آتا تو کوئی فرشتہ آتا نہ کہ ایک گوشت پوست کا آدمی جو زندہ رہنے کے لیے غذا کا محتاج ہو۔ تاہم اگر آدمی ہی رسول بنایا گیا تھا تو کم از کم وہ بادشاہوں اور دنیا کے بڑے لوگوں کی طرح ایک بلند پایہ ہستی ہونا چاہیے تھا جسے دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستیں اور جس کے حضور باریابی کا شرف بڑی کوششوں سے کسی کو نصیب ہوتا، نہ یہ کہ ایک ایسا عام آدمی خداوندِ عالم کا پیغمبر بنا دیا جائے جو بازاروں میں چلتا پھرتا ہو۔ بھلا اس آدمی کو کون خاطر میں لائے گا جسے ہر راہ چلتا روز دیکھتا ہو اور کسی پہلو سے بھی اُس کے اندر کوئی غیر معمولی پن نہ پایا ہو۔ بالفاظِ دیگر، اُن کی رائے میں رسول کی ضرورت اگر تھی تو عوام الناس کو ہدایت دینے کے لیے نہیں بلکہ

عجوبہ دکھانے یا ٹھاٹھ باٹھ سے دھونس جمانے کے لیے تھی۔

پھر وہ کہتے تھے کہ اگر آدمی ہی کو نبی بنایا گیا تھا تو کم از کم ایک فرشتہ تو اس کے ساتھ کر دیا جاتا جو ہر وقت کوڑا ہاتھ میں لیے رہتا اور لوگوں سے کہتا کہ مانو اس کی بات ورنہ ابھی خدا کا عذاب برسا دیتا ہوں۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ کائنات کا مالک ایک شخص کو نبوت کا جلیل القدر منصب عطا کر کے بس یونہی اکیلا چھوڑ دے اور وہ لوگوں سے گالیاں اور پتھر کھاتا پھرے۔

بدرجۂ آخر ان کا مطالبہ یہ تھا کہ اللہ میاں کم از کم اتنا تو کرتے کہ اپنے رسول کے لیے معاش کا کوئی اچھا انتظام کر دیتے۔ یہ کیا ماجرا ہے کہ خدا کا رسول ہمارے معمولی رئیسوں سے بھی گیا گزرا ہو۔ نہ خرچ کے لیے مال میسر، نہ پھل کھانے کو کوئی باغ نصیب، اور دعوٰی یہ کہ ہم اللہ رب العالمین کے پیغمبر ہیں۔

یہ باتیں بنا کر آخر کار وہ کہتے تھے کہ یہ شخص سحر زدہ ہے، یعنی کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے اور اس کی وجہ سے یہ دیوانہ ہو گیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اوپر ان کا جو قول منقول ہوا ہے اس میں وہ آپ کو ساحر کہتے تھے، اور یہاں وہ آپ کو مسحور قرار دیتے ہیں۔ اس پر ایک اور رد آ شاعر ہونے کی تہمت کا بھی تھا جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

اس اعتراض کا جواب

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ

تم سے پہلے بھی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنایا تھا۔

(الرعد ۳۸)

یہ اُس اعتراض کا جواب ہے جو وہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے تھے کہ یہ اچھا نبی ہے جو بیوی بچے رکھتا ہے۔ بھلا پیغمبروں کو بھی خواہشاتِ نفسانی سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ فرمایا گیا کہ پہلے جو رسول بھیجے گئے تھے آخر وہ بھی تو بیوی بچے رکھتے تھے۔ حضرت نوحؑ کو تم خود پیغمبر مانتے ہو۔ اگر وہ بال بچوں والے نہ ہوتے تو تم ان کی نسل سے کیسے پیدا ہوتے؟ حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کا پیغمبر ہونا تو تمہارے نزدیک مسلّم ہے۔ انہی سے تو تم اپنا نسب ملاتے ہو۔ پھر وہ بال بچوں والے نہ ہوتے تو تم کہاں سے بنی اسماعیل بن جاتے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا

اور اے محمدؐ، تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں

نُوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا یَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِیْنَ

ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر ہم وحی کیا کرتے تھے۔ تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہلِ کتاب سے پوچھ لو۔ اُن رسولوں کو ہم نے کوئی ایسا جسم نہیں دیا تھا کہ وہ کھاتے نہ ہوں، اور نہ وہ سدا جینے والے تھے۔

(الانبیاء ۷-۸)

یعنی یہ یہودی، جو آج اسلام کی دشمنی میں تمہارے ہم نوا ہیں اور تم کو مخالفت کے داؤں پیچ سکھایا کرتے ہیں، انہی سے پوچھ لو کہ موسیٰؑ اور دوسرے انبیاءِ بنی اسرائیل کون تھے؟ انسان ہی تھے یا کوئی اور مخلوق؟

اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِیْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ یَّهْدُوْنَنَا فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۔

کیا تمہیں اُن لوگوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جنہوں نے اس سے پہلے کفر کیا اور پھر اپنی شامتِ اعمال کا مزہ چکھ لیا؟ اور آگے (آخرت میں) اُن کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ اس انجام کے مستحق وہ اس لیے ہوئے کہ اُن کے پاس اُن کے رسول کھلی کھلی دلیلیں اور نشانیاں لے کر آتے رہے، مگر انہوں نے کہا "کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے"؟ اس طرح انہوں نے ماننے سے انکار کر دیا اور منہ پھیر لیا، تب اللہ بھی اُن سے بے پروا ہو گیا اور اللہ تو ہے ہی بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ محمود۔

(التغابن ۵-۶)

یعنی انبیاء ایسی صریح علامات اور نشانیاں لے کر آتے تھے جو اُن کے مامور من اللہ ہونے کی کھلی کھلی شہادت دیتی تھیں۔ وہ جو بات بھی پیش کرتے تھے نہایت معقول اور روشن دلیلوں کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ ان کی تعلیم میں کوئی ابہام نہ تھا، بلکہ صاف صاف بتاتے تھے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا؟ جائز کیا ہے اور ناجائز کیا؟ کس راہ پر انسان کو چلنا چاہیے اور کس راہ پر نہ چلنا چاہیے؟ لیکن لوگوں نے یہ کہہ کر ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا کہ "کیا اب انسان ہمیں ہدایت دیں گے"؟ اور یہی چیز ان کی تباہی کی موجب ہوئی۔ کیونکہ نوعِ انسانی کو دنیا میں صحیح راہِ عمل اس کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی تھی کہ اس کا خالق اُسے صحیح علم دے، اور خالق کی طرف سے علم دیے جانے کی عملی صورت اس کے سوا کچھ نہ ہو سکتی تھی کہ وہ انسانوں ہی میں سے

بعض افراد کو علم عطا کر کے دوسروں تک اسے پہنچانے کی خدمت سپرد کرے۔ اس غرض کے لیے اس نے انبیاء کو بینات کے ساتھ بھیجا تاکہ لوگوں کے لیے اُن کے برحق ہونے میں شک کرنے کی کوئی معقول وجہ نہ رہے۔ مگر انہوں نے سرے سے یہی بات ماننے سے انکار کر دیا کہ بشر خدا کا رسول ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد ان کے لیے ہدایت پانے کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ اس معاملہ میں گمراہ انسانوں کی جہالت و نادانی کا یہ عجیب کرشمہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ بشر کی رہنمائی قبول کرنے میں تو انہوں نے کبھی تامل نہیں کیا ہے، حتیٰ کہ کچھ انسانوں ہی کی رہنمائی میں لکڑی اور پتھر کے بتوں تک کو انہوں نے معبود بنا لیا، خود انسانوں کو خدا اور خدا کا اوتار اور خدا کا بیٹا تک مان لیا، اور گمراہ کن لیڈروں کی اندھی پیروی میں ایسے عجیب مسلک اختیار کر لیے جنہوں نے انسانی تہذیب و تمدن اور اخلاق کو تلپٹ کر کے رکھ دیا۔ مگر جب خدا کے رسول اُن کے پاس حق لے کر آئے اور انہوں نے ہر ذاتی غرض سے بالاتر ہو کر بے لاگ سچائی ان کے سامنے پیش کی تو انہوں نے کہا "کیا اب بشر ہمیں ہدایت دیں گے؟" اس کے معنی یہ تھے کہ بشر اگر گمراہ کرے تو سر آنکھوں پر، لیکن اگر وہ راہِ راست دکھاتا ہے تو اس کی رہنمائی قابلِ قبول نہیں ہے۔

پس جب انہوں نے اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت سے استغنا برتا تو پھر اللہ کو بھی اس کی کچھ پروا نہ رہی کہ وہ کس گڑھے میں جا کر گرتے ہیں۔ اللہ کی کوئی غرض تو ان سے اٹکی ہوئی نہ تھی کہ وہ اُسے خدا مانیں گے تو وہ خدا رہے گا ورنہ خدائی کا تخت اُس سے چھن جائے گا۔ وہ نہ ان کی عبادت کا محتاج تھا، نہ ان کی حمد و ثنا کا۔ وہ تو اُن کی اپنی بھلائی کے لیے انہیں راہِ راست دکھانا چاہتا تھا۔ مگر جب وہ اس سے منہ پھیر گئے تو اللہ بھی ان سے بے پروا ہو گیا۔ پھر نہ اُس نے اُن کو ہدایت دی، نہ اُن کی حفاظت اپنے ذمہ لی، نہ اُن کو مہالک میں پڑنے سے بچایا اور نہ انہیں اپنے اوپر تباہی لانے سے روکا، کیونکہ وہ خود اس کی ہدایت اور ولایت کے طالب نہ تھے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا	لوگوں کے سامنے جب کبھی ہدایت آئی تو اس پر
اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ	ایمان لانے سے اُن کو کسی چیز نے نہیں روکا مگر اُن
قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۔	کے اسی قول نے کہ "کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج
قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ	دیا؟" ان سے کہو اگر زمین میں فرشتے آرام سے چل پھر
يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا	رہے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے کسی فرشتے ہی کو

عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُولًا ۔ اُن کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجتے ۔

(بنی اسرائیل ۹۴ - ۹۵)

یعنی پیغمبر کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ آکر خدا کا پیغام سنا دیا کرے، بلکہ اس کا کام یہ بھی ہے کہ اس پیغام کے مطابق انسانی زندگی کی اصلاح کرے۔ اُسے انسانی احوال پر اُس پیغام کے اصولوں کا انطباق کرنا ہوتا ہے۔ اُسے خود اپنی زندگی میں اُن اصولوں کا عملی مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ اسے اُن بے شمار مختلف انسانوں کے ذہن کی گتھیاں سلجھانی پڑتی ہیں جو اس کا پیغام سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسے ماننے والوں کی تنظیم اور تربیت کرنی ہوتی ہے تاکہ اُس پیغام کی تعلیمات کے مطابق ایک معاشرہ وجود میں آئے۔ اُسے انکار اور مخالفت و مزاحمت کرنے والوں کے مقابلہ میں جدوجہد کرنی ہوتی ہے تاکہ بگاڑ کی حمایت کرنے والی طاقتوں کو نیچا دکھایا جائے اور وہ اصلاح عمل میں آسکے جس کے لیے خدا نے اپنا پیغمبر مبعوث فرمایا ہے۔ یہ سارے کام جبکہ انسانوں ہی کے درمیان کرنے کے ہیں تو ان کے لیے انسان نہیں تو اور کون بھیجا جاتا؟ فرشتہ تو زیادہ سے زیادہ بس یہی کرتا کہ آتا اور پیغام پہنچا کر چلا جاتا۔ انسانوں میں انسان کی طرح رہ کر انسان کے سے کام کرنا اور پھر انسانی زندگی میں منشائے الٰہی کے مطابق اصلاح کر کے دکھا دینا کسی فرشتے کے بس کا کام نہ تھا۔ اس کے لیے تو ایک انسان ہی موزوں ہو سکتا تھا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى (یوسف - ۱۰۹)

اے محمدؐ، تم سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھیجے تھے وہ سب اِنہی بستیوں کے رہنے والے انسان تھے جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے۔

یہاں ایک بہت بڑے مضمون کو ایک ہی جملے میں سمیٹ دیا گیا ہے، اس کو اگر کسی تفصیلی عبارت میں بیان کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے:

یہ لوگ تمہاری بات کی طرف اس لیے توجہ نہیں کرتے کہ جو شخص کل اُن کے شہر میں پیدا ہوا اور انہی کے درمیان بچے سے جوان اور جوان سے بوڑھا ہوا اس کے متعلق یہ کیسے مان لیں کہ یکایک ایک روز خدا نے اسے اپنا سفیر مقرر کر دیا۔ لیکن یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے جس سے آج دنیا میں پہلی مرتبہ انہی کو سابقہ پیش آیا ہو۔ اس سے پہلے بھی خدا اپنے نبی بھیج چکا ہے اور وہ بھی سب انسان ہی تھے۔ پھر یہ بھی کبھی نہیں ہوا کہ اچانک ایک اجنبی شخص کسی شہر میں نمودار ہو گیا ہو اور اس نے کہا ہو کہ میں پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ بلکہ جو

کسی منظم فکر کے بجائے تناقض اور ناہمواری ہوتی ہے ۔ اعتدال کے بجائے بے اعتدالی ہوا کرتی ہے ۔ وہ تو محض اپنا سکہ جمانے کے لیے زبان درازی کرتا ہے یا پھر لوگوں کو لڑانے اور ایک گروہ کو دوسرے کے مقابلے میں اُبھارنے کے لیے خطابت کی شراب پلاتا ہے ۔ اُس کے اثر سے لوگوں میں نہ کوئی اخلاقی بلندی پیدا ہوتی ہے، نہ ان کی زندگیوں میں کوئی مفید تغیر رونما ہوتا ہے ، نہ کوئی صالح فکر یا صالح عملی حالت وجود میں آتی ہے، بلکہ لوگ پہلے سے بدتر صفات کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں ۔ مگر یہاں تم دیکھ رہے ہو کہ پیغمبر جو کلام پیش کر رہا ہے اس میں حکمت ہے، ایک متناسب نظامِ فکر ہے، غایت درجے کا اعتدال اور حق وصداقت کا سخت التزام ہے، لفظ لفظ جچا تُلا اور بات بات کانٹے کی تول پوری ہے ۔ اس کی خطابت میں تم خلقِ خدا کی اصلاح کے سوا کسی دوسری غرض کی نشاندہی نہیں کر سکتے ۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اس میں اُس کی اپنی ذاتی یا خاندانی یا قومی یا کسی قسم کی دنیوی غرض کا کوئی شائبہ نہیں پایا جاتا ۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ لوگ جس غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اس کے بُرے نتائج سے ان کو خبردار کر دے اور انہیں اس طریقے کی طرف بلائے جس میں ان کا اپنا بھلا ہے ۔ پھر اس کی تقریر سے جو اثرات مترتب ہو رہے ہیں وہ بھی جادوگر قسم کے خطیبوں کی خطابت کے اثرات سے بالکل مختلف ہیں ۔ یہاں جس نے بھی اس کا اثر قبول کیا ہے اس کی زندگی سنور گئی ہے، وہ پہلے سے زیادہ بہتر اخلاق کا انسان بن گیا ہے، اور اس کے طرزِ عمل میں خیر وصلاح کی شان نمایاں ہوگئی ہے ۔ اب تم ہی سوچ لو، کیا جادوگر ایسی ہی باتیں کرتے ہیں اور ان کا جادو ایسے ہی نتائج پیدا کرتا ہے ؟

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ	ہم نے بعض پیغمبروں کو بعض سے بڑھ کر مرتبے
بَعْضٍ وَّآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا	دیئے اور ہم نے داؤدؑ کو زبور عطا کی ۔

(بنی اسرائیل ۔ ۵۵)

جس سلسلۂ کلام میں یہ بات ارشاد فرمائی گئی ہے اس میں داؤد علیہ السلام کو کتاب (زبور) دینے کا الگ ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ وہ بادشاہ تھے اور اس کے باوجود پیغمبر تھے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین جس وجہ سے آپ کی پیغمبری اور خدارسیدگی ماننے سے انکار کرتے تھے وہ ان کے اپنے بیان کے مطابق یہ تھی کہ آپ عام انسانوں کی طرح بیوی بچے رکھتے تھے، کھاتے پیتے تھے، بازاروں میں چل پھر کر خرید و فروخت کرتے تھے، اور وہ سارے ہی کام کرتے تھے جو کوئی دنیادار آدمی اپنی انسانی حاجات کے لیے کیا کرتا ہے ۔ کفارِ مکہ کا کہنا یہ تھا کہ تم تو ایک دنیادار آدمی ہو، تمہیں خدارسیدگی سے کیا تعلق ؟ پہنچے ہوئے لوگ تو وہ ہوتے

ہیں جنہیں اپنے تن بدن کا ہوش بھی نہیں ہوتا۔ بس ایک گوشے میں بیٹھے اللہ کی یاد میں غرق رہتے ہیں۔ وہ کہاں اور گھر کے آٹے دال کی فکر کہاں؟ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ ایک پوری بادشاہت کے انتظام سے بڑھ کر دنیا داری اور کیا ہوگی۔ مگر اس کے باوجود داؤدؑ کو نبوت اور کتاب سے سرفراز کیا گیا۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۔ (الاحقاف - ۹)

اے نبیؐ، اِن سے کہو میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ کل میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور تمہارے ساتھ کیا۔ میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے اور میں ایک صاف صاف خبردار کر دینے والے کے سوا کچھ نہیں ہوں۔

اِس ارشاد کا پس منظر یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو خدا کے رسول کی حیثیت سے پیش کیا تو مکّے کے لوگ اس پر طرح طرح کی باتیں بنانے لگے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو بال بچے رکھتا ہے۔ بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، کھاتا پیتا ہے، اور ہم جیسے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ آخر اس میں وہ نرالی بات کیا ہے جس میں یہ عام انسانوں سے مختلف ہو اور ہم یہ سمجھیں کہ خاص طور پر اسی شخص کو خدا نے اپنا رسول بنایا ہے۔ پھر وہ کہتے تھے کہ اگر اس شخص کو خدا نے رسول بنایا ہوتا تو وہ اس کی اَرْدَلی میں کوئی فرشتہ بھیجتا جو اعلان کرتا کہ یہ خدا کا رسول ہے اور ہر اس شخص پر خدا کا کوڑا برسا دیتا جو اس کی شان میں کوئی ذرا سی گستاخی کر بیٹھتا۔ یہ آخر کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کسی کو اپنا رسول مقرر کرے اور پھر اُسے یونہی مکّے کی گلیوں میں پھرنے اور ہر طرح کی زیادتیاں سہنے کے لیے بے سہارا چھوڑ دے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم یہی ہوتا کہ خدا اپنے رسول کے لیے ایک شاندار محل اور ایک لہلہاتا ہوا باغ ہی پیدا کر دیتا۔ یہ تو نہ ہوتا کہ اس کے رسول کی بیوی کا مال جب ختم ہو جائے تو اُسے فاقوں کی نوبت آ جائے اور طائف جانے کے لیے اسے سواری تک میسر نہ ہو۔ پھر وہ لوگ آپ سے طرح طرح کے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے اور غیب کی باتیں آپ سے پوچھتے تھے۔ ان کے خیال میں کسی شخص کا رسولِ خدا ہونا یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ فَوقَ البَشَری طاقتوں کا مالک ہو۔ اس کے ایک اشارے پر پہاڑ ٹل جائیں اور ریگ زار دیکھتے دیکھتے کشت زاروں میں تبدیل ہو جائیں۔ اس کو تمام مَا کَانَ

وَمَا يَكُوْنُ کا علم ہو اور پردۂ غیب میں چھپی ہوئی ہر چیز اس پر روشن ہو۔

ان باتوں کے جواب میں فرمایا کہ ان سے کہو "میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں"۔ یعنی میرا رسول بنایا جانا دنیا کی تاریخ میں کوئی پہلا واقعہ تو نہیں ہے کہ تمہیں یہ سمجھنے میں پریشانی لاحق ہو کہ رسول کیسا ہوتا ہے اور کیسا نہیں ہوتا۔ مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں اور میں اُن سے مختلف نہیں ہوں۔ آخر دنیا میں کب کوئی رسول ایسا آیا ہے جو بال بچے نہ رکھتا ہو؟ کھاتا پیتا نہ ہو؟ یا عام انسانوں کی سی زندگی بسر نہ کرتا ہو؟ کس رسول کے ساتھ کوئی فرشتہ اُترا ہے جو اس کی رسالت کا اعلان کرتا ہو اور اس کے آگے آگے ہاتھ میں کوڑا لیے پھرتا ہو؟ کس رسول کے لیے باغ اور محلات پیدا کیے گئے اور کس نے خدا کی طرف بُلانے میں وہ سختیاں نہیں جھیلیں جو میں جھیل رہا ہوں؟ کون سا رسول ایسا گزرا ہے جو اپنے اختیار سے کوئی معجزہ دکھا سکتا ہو یا اپنے علم سے سب کچھ جانتا ہو؟ پھر یہ نرالے معیار میری ہی رسالت کو پرکھنے کے لیے تم کہاں سے لیے چلے آرہے ہو؟

پھر اس کے بعد ان کے جواب میں یہ بھی کہا گیا کہ "میں نہیں جانتا کہ کل میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور تمہارے ساتھ کیا، میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھے بھیجی جاتی ہے"۔ یعنی میں عالم الغیب نہیں ہوں کہ ماضی، حال، مستقبل سب مجھ پر روشن ہوں اور دنیا کی ہر چیز کا مجھے علم ہو۔ تمہارا مستقبل تو درکنار، مجھے تو اپنا مستقبل بھی معلوم نہیں ہے۔ جس چیز کا وحی کے ذریعے سے مجھے علم دے دیا جاتا ہے بس اسی کو میں جانتا ہوں۔ اُس سے زائد کوئی علم رکھنے کا میں نے کب دعویٰ کیا ہے اور کونسا رسول ایسے علم کا مالک کبھی دنیا میں گزرا ہے کہ تم میری رسالت کو جانچنے کے لیے میری غیب دانی کا امتحان لیتے پھرتے ہو۔ رسول کا یہ کام کب سے ہو گیا کہ وہ کھوئی ہوئی چیزوں کے پتے بتائے یا یہ بتائے کہ حاملہ عورت لڑکا جنے گی یا لڑکی، یا یہ بتائے کہ مریض اچھا ہو جائے گا یا مر جائے گا؟

یہ اعتراض کہ حضورؐ ہی کیوں نبی بنائے گئے

ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اگر خدا کو نبی ہی بھیجنا تھا، اور انسانوں ہی میں سے کسی کو بھیجنا تھا تو کیا محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی ہمارے درمیان اس کام کے لیے اُس کو ملے؟ مکّے اور طائف کے بڑے بڑے لوگ مر گئے تھے کہ ان میں سے کسی کو اس کے لیے منتخب نہ کیا گیا؟ ان کا کہنا یہ تھا کہ:

ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا (ص-۸)

کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص تھا جس پر ذِکر (خدا کا پیغام نصیحت) نازل کیا گیا؟

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۭ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۭ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۔ (الزُّخرف ۳۱-۳۲)

اور وہ کہتے ہیں، "یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟" کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں اُن کی گزر بسر کرنے کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں، اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں۔ اور تیرے رب کی رحمت اُس دولت سے زیادہ قیمتی ہے جو (ان کے رئیس) سمیٹ رہے ہیں۔

دونوں شہروں سے مراد مکہ اور طائف ہیں۔ کفار کا کہنا یہ تھا کہ اگر واقعی خدا کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا اور وہ اُس پر اپنی کتاب نازل کرنے کا ارادہ کرتا تو ہمارے شہروں میں سے کسی بڑے آدمی کو اس غرض کے لیے منتخب کرتا۔ رسول بنانے کے لیے اللہ میاں کو ملا بھی تو وہ شخص جو یتیم پیدا ہوا، جس کے حصے میں کوئی میراث نہ آئی، جس نے بکریاں چرا کر جوانی گزار دی، جو اب گزر اوقات بھی کرتا ہے تو بیوی کے مال سے تجارت کر کے، اور جو کسی قبیلے کا شیخ یا کسی خانوادے کا سربراہ نہیں ہے۔ کیا مکہ میں ولید بن مغیرہ اور عُتبہ بن ربیعہ جیسے نامی گرامی سردار موجود نہ تھے؟ کیا طائف میں عُروہ بن مسعود، حَبیب بن عَمرو، کنانہ بن عبدِ عَمرو، اور ابنِ عبدِ یالیل جیسے رئیس موجود نہ تھے؟ یہ تھا اُن لوگوں کا استدلال۔ پہلے تو وہ یہی ماننے کے لیے تیار نہ تھے کہ کوئی بشر بھی رسول ہو سکتا ہے۔ مگر جب قرآن مجید میں پے در پے دلائل دے کر ان کے اس خیال کا پوری طرح ابطال کر دیا گیا، اور اُن سے کہا گیا کہ اس سے پہلے ہمیشہ بشر ہی رسول ہو کر آتے رہے ہیں، اور انسانوں کی ہدایت کے لیے بشر ہی رسول ہو سکتا ہے نہ کہ غیر بشر، اور جو رسول بھی دنیا میں آئے ہیں وہ یکایک آسمان سے نہیں اُتر آئے تھے بلکہ انہی انسانی بستیوں میں پیدا ہوئے تھے، بازاروں میں چلتے پھرتے تھے، بال بچوں والے تھے اور کھانے پینے سے مبرا نہ تھے، تو انہوں نے دوسرا پینترا بدلا کہ اچھا، بشر ہی

رسول سہی، مگر وہ کوئی بڑا آدمی تو ہونا چاہیئے۔ مالدار ہو، با اثر ہو، بڑے جتھے والا ہو، لوگوں میں اس کی شخصیت کی دھاک بیٹھی ہوئی ہو۔ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اِس مرتبے کے لیے کیسے موزوں ہو سکتے ہیں؟ اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے چند مختصر الفاظ میں بہت سی اہم باتیں ارشاد ہوئی ہیں:

پہلی بات یہ کہ تیرے رب کی رحمت تقسیم کرنا ان کے سپرد کب سے ہوگیا؟ کیا یہ طے کرنا اِن کا کام ہے کہ اللہ اپنی رحمت سے کس کو نوازے اور کس کو نہ نوازے؟ (یہاں رب کی رحمت سے مراد اس کی رحمتِ عام ہے جس میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ ملتا رہتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ نبوت تو خیر بہت بڑی چیز ہے، دنیا میں زندگی بسر کرنے کے جو عام ذرائع ہیں، ان کی تقسیم بھی ہم نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہے، کسی اور کے حوالے نہیں کر دی۔ ہم کسی کو حسین اور کسی کو بدصورت، کسی کو خوش آواز اور کسی کو بد آواز، کسی کو تندرست اور کسی کو اپاہج یا اندھا یا گونگا یا بہرا، کسی کو امیرزادہ اور کسی کو فقیرزادہ، کسی کو ترقی یافتہ قوم کا فرد اور کسی کو غلام یا پس ماندہ قوم کا فرد پیدا کرتے ہیں۔ اس پیدائشی قسمت میں کوئی ذرہ برابر بھی دخل نہیں دے سکتا۔ جس کو ہم نے جو کچھ بنا دیا ہے وہی کچھ بننے پر وہ مجبور ہے۔ اور اِن مختلف پیدائشی حالتوں کا جو اثر بھی کسی کی تقدیر پر پڑتا ہے اُسے بدل دینا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ پھر انسانوں کے درمیان رزق، طاقت، عزت، شہرت، دولت، حکومت وغیرہ کی تقسیم بھی ہم ہی کر رہے ہیں۔ جس کو ہماری طرف سے اقبال نصیب ہوتا ہے اسے کوئی گرا نہیں سکتا، اور جس پر ہماری طرف سے اِدبار آجاتا ہے اُسے گرنے سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ ہمارے فیصلوں کے مقابلے میں انسانوں کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ اس عالمگیر خدائی نظام میں یہ لوگ کہاں فیصلہ کرنے چلے ہیں کہ کائنات کا مالک کسے اپنا نبی بنائے اور کسے نہ بنائے۔

تیسری بات یہ کہ اس خدائی انتظام میں یہ مستقل قاعدہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ سب کچھ ایک ہی کو، یا سب کچھ سب کو نہ دے دیا جائے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو۔ ہر طرف تمہیں بندوں کے درمیان ہر پہلو میں تفاوت ہی تفاوت نظر آئے گا۔ کسی کو ہم نے کوئی چیز دی ہے تو دوسری کسی چیز سے اُس کو محروم کر دیا ہے، اور وہ کسی اور کو عطا کر دی ہے۔ یہ اِس حکمت کی بنا پر کیا گیا ہے کہ کوئی انسان دوسرے سے بے نیاز نہ ہو بلکہ ہر ایک کسی نہ کسی معاملہ میں دوسرے کا محتاج رہے۔ اب یہ کیسا احمقانہ خیال تمہارے دماغ میں سمایا ہے کہ جسے ہم نے ریاست اور وجاہت دی ہے اُسی کو نبوت بھی دے دی جائے؟ کیا اسی طرح تم یہ بھی کہو گے کہ عقل،

علم، دولت، حُسن، طاقت، اقتدار اور دوسرے تمام کمالات ایک ہی میں جمع کر دیئے جائیں اور جس کو ایک چیز نہیں ملی ہے اُسے دوسری بھی کوئی چیز نہ دی جائے ؟

آخری فقرے میں رب کی رحمت سے مراد اُس کی رحمتِ خاص، یعنی نبوت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے جن رئیسوں کو ان کی دولت و وجاہت اور مشیخت کی وجہ سے بڑی چیز سمجھ رہے ہو، وہ اِس دولت کے قابل نہیں ہیں جو محمد ابن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دی گئی ہے۔ یہ دولت اُس دولت سے بدرجہا زیادہ اعلیٰ درجے کی ہے اور اس کے لیے موزونیت کا معیار کچھ اور ہے۔ تم نے اگر یہ سمجھ رکھا ہے کہ تمہارا ہر چودھری اور سیٹھ نبی بننے کا اہل ہے تو یہ تمہارے اپنے ذہن کی پستی ہے۔ اللہ سے اس نادانی کی توقع کیوں رکھتے ہو؟

اِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۔ (المومن ۔ ۵۶)

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ کسی سند و حجت کے بغیر جو اُن کے پاس آئی ہو، اللہ کی آیات میں جھگڑے کر رہے ہیں اُن کے دلوں میں کبر بھرا ہوا ہے، مگر وہ اُس بڑائی کو پہنچنے والے نہیں ہیں جس کا وہ گھمنڈ رکھتے ہیں۔ بس اللہ کی پناہ مانگ لو، وہ سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے۔

یعنی اِن لوگوں کی بے دلیل مخالفت اور ان کی غیر معقول کج بحثیوں کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ کی آیات میں جو سچائیاں اور خیر و صلاح کی باتیں اُن کے سامنے پیش کی جا رہی ہیں وہ ان کی سمجھ میں نہیں آتیں اس لیے یہ نیک نیتی کے ساتھ ان کو سمجھنے کی خاطر بحثیں کرتے ہیں۔ بلکہ اِن کے اِس رویّہ کی اصل وجہ یہ ہے کہ اِن کا غرورِ نفس یہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ ان کے ہوتے عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشوائی و رہنمائی تسلیم کر لی جائے اور بالآخر ایک روز اِنہیں خود بھی اُس شخص کی قیادت ماننی پڑے جس کے مقابلے میں یہ اپنے آپ کو سرداری کا زیادہ حق دار سمجھتے ہیں۔ اِسی وجہ سے یہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کسی طرح نہ چلنے پائے، اور اِس مقصد کے لیے اِنہیں کوئی ذلیل سے ذلیل حربہ استعمال کرنے میں بھی تامل نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ جس کو اللہ نے بڑا بنایا ہے وہی بڑا بن کر رہے گا، اور یہ چھوٹے لوگ اپنی بڑائی قائم رکھنے کی جو کوششیں کر رہے ہیں وہ سب آخر کار ناکام ہو جائیں گی۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (النحل - آیت ۲)	وہ اِس روح (یعنی وحیِ نبوت) کو اپنے جس بندے پر چاہتا ہے اپنے حکم سے فرشتوں کے ذریعے نازل فرماتا ہے۔

یہ کفّار کے اُن اعتراضات کا جواب ہے جو وہ حضورؐ پر کرتے تھے کہ اگر خدا کو نبی ہی بھیجنا تھا تو کیا بس محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی اس کام کے لیے رہ گئے تھے؟ مکّے اور طائف کے سارے بڑے بڑے سردار مر گئے تھے کہ ان میں سے کسی پر بھی نگاہ نہ پڑ سکی؟ اس طرح کے بیہودہ اعتراضات کا جواب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے، اور یہی متعدد مقامات پر قرآن میں دیا گیا ہے، کہ خدا اپنے کام کو خود جانتا ہے، تم سے مشورہ لینے کی اُسے حاجت نہیں ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو مناسب سمجھتا ہے آپ ہی اپنے کام کے لیے منتخب کرلیتا ہے۔

مشرکین کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ جو کچھ محمد صلی اللہ علیہ **وسلم پیش کر رہے ہیں وہ اگر حق ہوتا تو قوم کے بڑے لوگ ایمان لاتے** یہ اعتراض کہ اگر یہ حق ہوتا تو سب سے پہلے قوم کے بڑے لوگ ایمان لاتے، نہ کہ چند ناسمجھ نوجوان، چند غلام اور چند غریب آدمی۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ ۭ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ (الاحقاف - آیت ۱۱)	جن لوگوں نے ماننے سے انکار کر دیا وہ ایمان لانے والوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ "اگر یہ حق ہوتا تو یہ لوگ اِس معاملے میں ہم سے سبقت نہ لے جاسکتے تھے"۔ چونکہ انہوں نے اس سے ہدایت نہ پائی اس لیے اب یہ ضرور کہیں گے کہ یہ تو پُرانا جھوٹ ہے۔

یہ اُن دلائل میں سے ایک ہے جو قریش کے سردار عوام الناس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بھڑکانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر یہ قرآن برحق ہوتا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک صحیح بات کی طرف دعوت دے رہے ہوتے تو قوم کے سردار اور شیوخ اور معززین آگے بڑھ کر اس کو قبول کرتے۔ آخر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ چند ناتجربہ کار لڑکے اور چند ادنیٰ درجہ کے غلام تو ایک معقول بات کو مان لیں اور قوم کے بڑے بڑے لوگ جو دانا اور جہاندیدہ ہیں، اور جن کی عقل و تدبیر پر آج تک قوم اعتماد کرتی رہی ہے، اس کو رد کر دیں؟ اِس پُرفریب استدلال سے وہ عوام الناس کو مطمئن کرنے

کی کوشش کرتے تھے کہ اس نئی دعوت میں ضرور کچھ خرابی ہے، اسی لیے تو قوم کے اکابر اس کو نہیں مان رہے ہیں، لہٰذا تم لوگ بھی اس سے دُور بھاگو۔

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے آپ کو حق و باطل کا معیار قرار دے رکھا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ جس ہدایت کو یہ قبول نہ کریں وہ ضرور ضلالت ہونی چاہیے۔ لیکن یہ اسے "نیا جھوٹ" کہنے کی ہمت نہیں رکھتے، کیونکہ اس سے پہلے بھی انبیاء علیہم السلام یہی تعلیمات پیش کرتے رہے ہیں، اور تمام کتب آسمانی جو اہلِ کتاب کے پاس موجود ہیں انہی عقائد اور انہی ہدایات سے بھری ہوئی ہیں۔ اس لیے یہ اسے "پُرانا جھوٹ" کہتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک وہ سب لوگ بھی دانائی سے محروم تھے جو ہزاروں برس سے ان حقائق کو پیش کرتے اور مانتے چلے آرہے ہیں، اور تمام دانائی صرف ان کے حصہ میں آگئی ہے۔

ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق قریش کے سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ یہ بلالؓ اور صہیبؓ اور عمارؓ اور خبابؓ اور ابن مسعودؓ جیسے غریب لوگ جو تمہاری صحبت میں بیٹھا کرتے ہیں، اِن کے ساتھ تو ہم نہیں بیٹھ سکتے۔ انہیں ہٹاؤ تو ہم تمہاری مجلس میں آسکتے ہیں اور معلوم کرسکتے ہیں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔

قیصر روم، ہِرَقل کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامہ مبارک ملا اور اس نے ابوسفیان کو بُلا کر آپؐ کے متعلق چند سوالات کیے تو ابوسفیان نے ان کا جواب دیتے ہوئے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ تَبِعَهٗ مِنَّا الضعفاء والمساکین "اس شخص کی پیروی ہمارے کمزور اور مسکین لوگوں نے قبول کی ہے۔" گویا ان لوگوں کا طرز فکر یہ تھا کہ حق صرف وہ ہے جسے قوم کے بڑے لوگ حق مانیں، کیونکہ وہی عقل اور سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ رہے چھوٹے لوگ، تو ان کا چھوٹا ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بے عقل اور ضعیف الرائے ہیں۔ اس لیے ان کا کسی بات کو مان لینا اور بڑے لوگوں کا اسے رد کر دینا صاف طور پر یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ ایک بے وزن بات ہے۔ ٹھیک یہی بات حضرت نوحؑ سے ان کی قوم کے سرداروں نے کہی تھی کہ کیا "ہم تجھے مان لیں حالانکہ تیری پیروی رذیل ترین لوگوں نے اختیار کی ہے؟" اور سورۂ ہود آیت ۲۷ میں ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ "ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ تیری پیروی صرف ان لوگوں نے بے سمجھے بوجھے کی ہے جو ہمارے ہاں کے اراذل ہیں۔"

(باقی)

الایمان والاصلاح

شیخ یوسف القرضاوی

ترجمہ:۔ عبدالحمید صدیقی

قوموں اور جماعتوں کی اصلاح بغیر کسی اصول و ضابطہ کے محض اتفاقات کے تھپیڑوں سے نہیں ہو جایا کرتی، جو قومیں گرنے کے بعد سنبھلنے اور اضمحلال کے بعد اپنے اندر قوت و توانائی پیدا کرنے کی آرزومند ہوتی ہیں وہ اپنے سامنے تربیت و اصلاح کا واضح پروگرام اور عزم رکھتی ہیں جن پر عمل پیرا ہوئے بغیر وہ رفعت اور سربلندی کا کوئی مقام حاصل نہیں کر سکتیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔ قرآن مجید میں اس اصول کی بڑے صاف الفاظ میں یوں نشاندہی کی گئی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ — اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ اپنی حالت خود نہ بدلے۔

مگر اپنی حالت کو بدلنے والی بات ہے بہت مشکل۔ دریاؤں کے رخ بدلنے آسان ہیں، زمین کا سینہ شق کرنا اور پہاڑوں کے جگر چھید ڈالنا ممکن ہے مگر قلوب و نفوس کے اندر تبدیلی بہت ہی مشکل ہے۔ اس ناممکن کو ممکن بنانے والی قوت صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے ایمان کی قوت۔ علمائے نفسیات کا کہنا ہے کہ انسان کی تربیت و اصلاح کا ایک معین وقت ہوتا ہے یعنی سن الطفولۃ۔ اگر یہ وقت گزر جائے تو پھر تکوین عادات اور تہذیب اخلاق کی کوشش رائگاں جاتی ہے۔ اسی طرح وہ اس امر کو بھی بہت اہمیت دیتے ہیں کہ آدمی جس ماحول میں پیدا ہوتا، بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے وہ بھی اس کے بناؤ اور بگاڑ کا بہت حد تک ذمہ دار ہوتا ہے۔ لیکن ہم جس قوت ایمانی کا ذکر کر رہے ہیں اس کی معجز نمائی و کارفرمائی ہر آن مسلّم ہے۔ چاہے آدمی عمر کے کسی مرحلہ میں داخل ہو اور چاہے اس کے حالات اس کی تبدیلی کی راہ میں سنگ گراں بن کر کھڑے ہوں ایمان کی ایک لہر ہی اس کے دل و دماغ کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔

دربارِ فرعون سے وابستہ جادوگروں کی قلب ماہیت کو دیکھ لیجیے:

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا
لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۙ يُّرِيْدُ اَنْ
يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ
بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝
قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ
فِى الْمَدَاۗىِٕنِ حٰشِرِيْنَ ۝
يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ ۝
فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ
مَّعْلُوْمٍ ۝ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ
مُّجْتَمِعُوْنَ ۝ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ
اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ فَلَمَّا
جَاۗءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَىِٕنَّ
لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝
قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ
الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى
اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝ فَاَلْقَوْا
حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ
فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ ۝
فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ
مَا يَاْفِكُوْنَ ۝ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۝
قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ رَبِّ
مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۝ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ

فرعون اپنے گرد و پیش کے سرداروں سے بولا
یہ شخص یقیناً ایک ماہر جادوگر ہے اور چاہتا ہے
کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہارے ملک سے
نکال دے اب بتاؤ تم کیا حکم دیتے ہو۔ انہوں نے
کہا اسے اور اس کے بھائی کو روک لیجیے اور شہروں
میں ہرکارے بھیج دیجیے کہ ہر ماہر جادوگر کو آپ کے
پاس لے آئیں۔ چنانچہ ایک مقررہ وقت پر جادوگر
اکٹھے کر لیے گئے اور لوگوں سے کہا گیا کہ تم اجتماع میں
چلو گے شاید کہ ہم جادوگروں کے دین ہی پر رہ جائیں
اگر وہ غالب رہے۔ جب جادوگر میدان میں آئے
تو انہوں نے فرعون سے کہا ہمیں انعام تو ملے گا اگر ہم
غالب رہے اس نے کہا ہاں اور تم تو اسی وقت مقربین
میں شامل ہو جاؤ گے۔ موسیٰؑ نے کہا پھینکو جو تمہیں
پھینکنا ہے۔ انہوں نے فوراً اپنی رسیاں اور
لاٹھیاں پھینک دیں اور بولے فرعون کے اقبال سے
ہی غالب رہیں گے۔ پھر موسیٰؑ نے اپنا عصا پھینکا
تو یکایک وہ ان کے جھوٹے کرشموں کو ہڑپ کرتا چلا
جا رہا تھا۔ اس پر سارے جادوگر بے اختیار سجدے
میں گر پڑے اور بول اٹھے کہ مان گئے ہم رب العالمین
کو۔ موسیٰؑ اور ہارون کے رب کو۔ فرعون نے کہا
تم موسیٰؑ کی بات مان گئے قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت
دیتا۔ ضرور یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے

قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَکُمْ ۚ اِنَّهٗ لَکَبِیْرُکُمُ الَّذِیْ عَلَّمَکُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۬ؕ لَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّکُمْ اَجْمَعِیْنَ ۚ قَالُوْا لَا ضَیْرَ ۫ اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۚ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰیٰنَاۤ اَنْ کُنَّاۤ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ (الشعراء۔ ۴۹ تا ۵۱)۔

اچھا ابھی تمہیں معلوم ہوا جاتا ہے۔ میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواؤں گا اور تم سب کو سولی چڑھا دوں گا۔ انہوں نے جواب دیا کچھ پروا نہیں ہم اپنے رب کے حضور پہنچ جائیں گے۔ اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہمارے گناہ معاف کر دے گا کیوں کہ سب سے پہلے ہم ایمان لائے ہیں

غور کیجیے ان کی شخصیات کیسے بدل کر رہ گئیں۔ کتنا بڑا اصلاحی انقلاب آناً فاناً ان کے اندر برپا ہوگیا۔ کہاں ان کی سوچ کا یہ انداز کہ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ کُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِیْنَ (ہمیں انعام تو یقیناً ملے گا اگر ہم غالب رہے) اور کہاں یہ بلندیٔ فکر کہ لَنْ نُّؤْثِرَکَ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ (ہم تجھے ہرگز ترجیح نہیں دے سکتے ان روشن دلائل پر جو ہمارے پاس آچکے) اور پہلی نیازمندی کے مقابلے میں ذرا بعد کی جرأتِ ایمانی کے تیور دیکھیے۔ فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ (تو ہمارے خلاف جو بھی فیصلہ کرنا چاہتا ہے کر لے)۔

آج مغربی تاریخ دان حیران ہیں کہ باشندگانِ عرب جو بکریاں چرایا کرتے تھے قوموں اور ملکوں کے حکمران کیوں کر بن گئے۔ بادیہ نشین تمدن و حضارۃ کے رموز کیسے پاگئے اور انہیں فتح و نصرت کا کونسا گُر ہاتھ آگیا تھا کہ قیصر و کسریٰ کی باجبروت حکومتوں کے تختے اُلٹنے میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں اور وہ راز بھی زیادہ دیر تک راز نہیں رہا بلکہ سرِ عیاں ہوچکا ہے۔ عربوں کی کایا پلٹ دینے والی چیز اکسیر ایمان تھی جس کے ذریعے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کی زندگیوں میں محیر العقول انقلاب پیدا کیا۔ اسی اکسیر کی بدولت ان کے حالات میں تغیر رونما ہوا، ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا پورا ڈھانچہ تبدیل ہوا۔ بتوں کے پوجنے والے خدا پرست بن گئے اور جاہلیت کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھانے والوں کے سینے نورِ ایمان سے منور ہوگئے۔

اقفالِ حیات کے لیے واحد کلید حیاتِ انسانی کا عظیم الشان قصر ہر طرف سے مقفل تھا اور اس کے دروا

ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی ۔ عقلِ انسانی مقفل تھی جسے حکماء و فلاسفر کھولنے سے عاجز تھے ۔ ضمیرِ انسان مقفل تھا اور واعظین و مرشدین اس کا تالا توڑنے میں ناکام ہو چکے تھے ۔ دل و دماغ مقفل تھے جنہیں حوادثِ زمانہ کے تھپیڑے تک کھول نہ سکے تھے ۔ مواہب و عطایا مقفل تھے اور کوئی تعلیم و تربیت ان پر اثر انداز نہ ہو رہی تھی ۔ مدرسہ مقفل تھا جسے کھولنے پر اساتذہ و علماء قادر نہ تھے ۔ خاندانی نظام مقفل تھا اور اس کے آگے مصلحین و مفکرین کی کوئی پیش نہ چلتی تھی ۔ قصرِ حکومت مقفل تھا جسے مظلوم عوام محنت کش کسان اور غریب مزدور اپنی متحدہ کوشش سے کھول نہ سکتے تھے ۔ دولت مندوں کے خزانے مقفل تھے اور ان کے قفل غریبوں کی بھوک اور عورتوں اور بچوں کی برہنگی توڑ نہ سکتی تھی ۔ عظیم مصلحین نے بارہا کوشش کی کہ ان تالوں کو توڑ دیا جائے تاکہ انسانیت کو زندگی کی حقیقی مسرتوں سے ہمکنار کیا جا سکے مگر بارہا انہوں نے منہ کی کھائی ۔

حیاتِ انسانی کی اس مشکل کو بڑے بڑے دارالحکومتوں میں حل نہ کیا جا سکا ۔ عظیم الشان یونیورسٹیاں اور درسگاہیں اس سے عاجز آ گئیں تو اللہ کی رحمت کو جوش آیا اور ایک پہاڑ کی چوٹی پر ایک چھوٹی سی غار میں فروکش انسانیت کے ایک عظیم محسن کے ہاتھ پر اس مشکل کو آسان کر دیا گیا ۔ اور تمام اقفالِ حیات کی کلید ان کی خدمت میں پیش کر دی گئی ۔ یعنی ایمان باللہ والرسول والیوم الآخر کی شاہ کلید جس نے ایک ایک قفلِ حیات کو کھول دیا ۔

اس کلید نے عقلِ انسانی کا قفل کھول دیا اور وہ انفس و آفاق میں اللہ کی بے شمار نشانیاں دیکھنے کے قابل ہو گئی اور شرک و بت پرستی کی برائی کو محسوس کرنے لگی ۔ اس نے خوابیدہ ضمیرِ انسانی کا قفل کھول دیا اور وہ بیدار ہو گیا اور شعورِ حقیقت سے بہرہ ور ہو کر خوب و ناخوب میں امتیاز کرنے لگا ۔ اس نے ان دلوں کے قفل کھول دیئے جو نہ کسی چیز سے عبرت پکڑتے تھے نہ زجر و توبیخ کا کوئی اثر ان پر ہوتا تھا اور نہ نرمی و رقت ان میں پیدا ہوتی تھی مگر ایمان باللہ کی کلید کے استعمال سے ان کے اندر خشوع و خضوع پیدا ہوا اور وہ حوادثِ روزگار سے عبرت پکڑنے لگے ۔ کسی مظلوم کو دیکھتے تو اُن کے دل کے اندر ارتعاش پیدا ہو جاتا اور ضعیف و ناتواں پر نظر پڑتی تو جذباتِ رحم و شفقت سے مملو ہو جاتے ۔ اس سے پہلے حیاتِ انسانی کا دامن اللہ کی عطا کردہ صلاحیتوں اور دیگر مواہب و قویٰ سے معمور تو تھا مگر یہ تمام استعدادیں مقفل تھیں ۔ ایمان باللہ کی کلید نے یہ اعجاز دکھایا کہ انسان کی جملہ مخفی استعدادیں اجاگر کر دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ بکریوں اور اونٹوں کے چرانے والے

اقوام و ملل کے پاسبان بن گئے۔ نیابت الٰہی سے ہمکنار ہو کر عالم پر حکمرانی کرنے لگے اور جو قبیلوں کے سردار تھے وہ ممالک و دول کی قیادت و سیادت پہ فائز ہو گئے۔ اس کلید نے درسگاہوں اور دانشکدوں کے قفل کھول دیئے اور دنیا کو علم کے شرف سے آگاہی نصیب ہوئی اور عالم و متعلم اور مربی و معلّم کے فضل و تفوق پہ رشک کرنے لگی۔ گھر گھر تدریس و تعلیم کی مسند بچھ گئی اور ہر بچے بوڑھے اور نوجوان کے لیے زیورِ علم سے آراستہ ہونا ضروری ٹھہرا۔ اِسی کلید نے عدل و انصاف کے مقفل ایوان تک اہلِ عالم کو رسائی بخشی چنانچہ حکام و قضاۃ عدل و انصاف اور پوری احساس ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرنے لگے اور مظلوموں اور ستم کشوں کے دن پھر گئے اور ظلم و جور سے معمور خدا کی خدائی، رحمتِ الٰہی کا گہوارہ بن گئی۔ اس کلید کے ہاتھ لگنے سے پہلے خاندانی نظام تہ و بالا تھا۔ بیٹا باپ کے حقوق پہ دست درازی کر رہا تھا اور بھائی بھائیوں کو لوٹنے کے درپے تھا۔ مزید برآں خاندانی نظام کا یہ فساد معاشرہ تک متعدی ہو چکا تھا۔ آقا خادموں پر ستم توڑ رہے تھے اور بڑے چھوٹوں پہ۔ اِن حالات میں ایمان باللہ کی کلید نے ہر ایک کو دوسرے کے حقوق یاد دلائے اور ان کا تحفظ کرنا سکھایا، باہمی رحمت و مؤدت پر تعلّقات استوار کیے۔ خدا کا خوف اور آخرت کی فکر دلوں پہ مسلط کی اور اس حقیقت کا گہرا شعور بخشا کہ آدمیت، انسانیت کے احترام اور انسانیت کی خدمت کا نام ہے۔ معاشرتی زندگی کی چولیں ڈھیلی ہو چکی تھیں انہیں پھر سے کس دیا اور معاشرہ میں عدل و اخوت کی روح دوڑا دی، خیر خواہی و ہمدردی کے جذبات پیدا کر دیئے۔ قوم کا سردار قوم کا خادم بن گیا اور امراء و اغنیاء نے اپنی دولت کا رُخ غرباء و مساکین اور محروم لوگوں کی طرف پھیر دیا۔

قصّہ مختصر یہ کہ افرادِ معاشرہ کی اصلاح کے لیے جتنا مؤثر کردار ایمان ادا کرتا ہے اور کوئی چیز نہیں کرتی لہٰذا جس طرح کلیدِ ایمان سے سینکڑوں سال پہلے معاشرہ مبدل بہ اصلاح ہو گیا تھا اسی طرح دورِ جدید کے تمام مشکل مسائلِ حیات کو بھی ایمان کی بنیاد پر حل کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بات بالکل غلط ہے کہ جدید مسائلِ حیات کے لیے یہ قدیم کلید کارآمد نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ نہ مسائل جدید ہیں اور نہ ان کے حل کے لیے کسی جدید کلید کی ضرورت ہے کیونکہ ؎

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصّۂ جدید و قدیم

زندگی کے مسائل جو آج سے ہزاروں سال پہلے تھے وہی آج بھی فکر انسانی پر تسلط جمائے ہوئے

ہیں۔ فرق جو کچھ پڑا ہے وہ صرف یہ ہے کہ یہ مسائل نئے رنگ میں سامنے آئے ہیں۔ آج سے ہزاروں سال پہلے انسان کو امن کی ضرورت تھی اور آج بھی انسان اس کا بشدت ضرورت مند ہے۔ آفاتِ ارضی و سماوی، دکھ تکلیفیں اور بیماریاں پہلے بھی انسانوں کو لاحق تھیں اور آج بھی ہیں۔ انسان ایک دوسرے کے حقوق پر پہلے بھی ڈاکے ڈالتا تھا اور آج بھی اس تہذیب و تمدن کے روشن دور میں بھی یہ ڈاکہ زنی عام ہے۔ جھوٹ، مکر و فریب، وعدہ خلافی و بدعہدی جیسے اوصاف رذیلہ اُس زمانے میں بھی انسان کے لیے مضر تھے جب وہ اونٹوں اور گدھوں پر سواری کرتا تھا اور آج بھی جب کہ وہ کاروں اور جیٹ طیاروں میں سفر کرتا ہے ان کی مضرت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ظلم و جور انسانوں کا انسانوں کے ہاتھوں استحصال پتھر کے زمانے میں بھی ہوتا تھا اور آج جب ایٹم کا دور ہے استبداد و استحصال پر مبنی کارروائیاں جوں کی توں ہیں۔ خدا کے خوف سے عاری لوگوں اور انبیاء و رسل کی تعلیمات سے انحراف کرنے والوں کی پہلے بھی کمی نہ تھی اور آج بھی کمی نہیں۔ مرد و عورت اور فرد و معاشرہ کے تعلقات میں عالم انسانی افراط و تفریط کا پہلے بھی شکار رہا ہے اور آج بھی شکار ہے۔ پس جب زندگی کے مسائل اپنی حقیقت کے اعتبار سے پرانے ہی ہیں تو کیا مضائقہ ہے اگر ان کا علاج بھی وہی اختیار کر لیا جائے جو صدیوں سے شافی ثابت ہو رہا ہے۔ یعنی اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَ مَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ۔

صفتِ ایمان سے متصف افراد ہی درحقیقت اصلاح یافتہ افراد ہوتے ہیں جن سے صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے اور صالح معاشرہ ہی اصلاحِ افراد کا بھی ضامن ہوتا ہے۔ اس طرح ایمان، افرادِ معاشرہ کو بیک وقت صالح و مصلح حیثیت دے کر معاشرتی زندگی کے اردگرد ایک زبردست حصار قائم کر دیتا ہے جو اس میں سے ایمان و اصلاح کے عنصر کو کبھی خارج نہیں ہونے دیتا۔

اِن گزارشات کا ماحصل یہ ہے کہ نوعِ بشری کے لیے واحد اور منفرد راہ نجات راہ ایمان ہی ہے۔ مسلمانوں کے لیے تو اس کی حیثیت رگ جان سے بھی زیادہ ہے۔ اسی راہ پر چل کر وہ اپنے مقاصد کو حاصل کر سکتے ہیں اور اپنی امنگوں اور ارمانوں کو پورا کر سکتے ہیں۔ انہیں آخرت مطلوب ہو تو ایمان کی بدولت حاصل ہو سکتی ہے۔ دنیا مطلوب ہو تو اس کے حصول کا راستہ بھی یہی ہے۔ دونوں کی طلب ہو تو ایمان اس کی بھی ضمانت دے سکتا ہے۔ جہاں تک ایمان کے ذریعے اخروی سعادت کے حصول کا تعلق ہے اس امر کی وضاحت ہم کسی دوسرے موقع پر اٹھا رکھتے ہیں۔

ضبط و نظم پیدا ہو اور انسان بہتر اور شادکام زندگی گزارنے کے قابل ہو۔

اور ایمان سے ہماری مراد دینِ اسلام کا پیش کردہ ایمان ہے، قرآن و سنّت کا ایمان اور صحابہ و تابعین کا ایمان جو عرفانِ الٰہی، حُسنِ نیت و اعتقاد اور عملِ صالح سے عبارت ہے۔ وہ عقلی ایمان نہیں جو متکلمین کے ہاں ملتا ہے۔ نہ وہ روحانی ایمان جو اہلِ تصوف کا خاصہ اور نہ وہ خشک ظاہریت پہ مبنی ایمان جو جمود پرست فقہاء کے ہاں پایا جاتا ہے۔

ہمارا مطلوبہ ایمان محض ایک شعار اور دعوت ہی نہیں بلکہ وہ ایک مکمل اسلوب حیات ہے، فرد کے لیے بھی اور قوم کے لیے بھی۔ نہایت تیز روشنی ہے جو فرد کی دنیائے فکر و ارادہ کو منور کرتی ہے اور جب اس کی شعاعیں معاشرہ پہ پڑتی ہیں تو اس کی رگوں میں خونِ زندگی دوڑنے لگتا ہے۔ اس کے رگ و پے میں امن و عافیت سرایت کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ مریض ہوتا ہے اور دوائے ایمان اسے شفایاب کر دیتی ہے بلکہ وہ مر چکا ہوتا ہے اور اکسیر ایمان اُسے حیاتِ نو بخش دیتی ہے۔ سچ ہے کہ ایمان رموزِ الٰہی کا راز داں ہوتا ہے وہ جب کسی چیز کو کہتا ہے ہو تو وہ وجود میں آجاتی ہے۔

حقیقی ایمان پوری زندگی پر اپنے نقوش و اثرات مترتب کرتا ہے اور اسے صبغۃ اللہ میں رنگ دیتا ہے۔ انسان کے افکار و نظریات، اس کے جذبات و اطوار سب اطاعتِ الٰہی اور بندگیٔ رب کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہوتا جس پر یہ رنگ گہرا نہ ہو۔ صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ۔

وہ قوم جو ایمان سے منور زندگی بسر کرنا چاہتی ہے اسے اپنے جملہ اصول و مناہج تقاضائے ایمان کے مطابق بدلنا ہوں گے اور ہر اس چیز سے دست کش ہونا پڑے گا جو نورِ ایمان کا راستہ روکنے والی ہو۔ اگر کوئی قوم یہ قربانی نہیں دیتی مگر اسلام و ایمان کا دعویٰ کرتی چلی جاتی ہے تو اس کے اِس دعویٰ کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ دعویٰ بلا دلیل ہے۔

اے اللہ اُمتِ مسلمہ کی صراطِ ایمان کی طرف رہنمائی فرما۔ صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضآلین۔ آمین ـــــ اِلٰہَ الحقِ آمین۔

قادیانی مسئلہ اور اس کا صحیح حل

ابوالاعلیٰ مودودی

گذشتہ ماہِ مئی کے حادثۂ ربوہ پر مسلمانوں میں جو ردِعمل واقع ہوا اور غلام احمدی اُمّت کو اُمّتِ محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے الگ کرنے کے لیے پاکستان کے تمام مسلمانوں نے کامل اتحاد و اتفاق کے ساتھ جو جدوجہد شروع کی وہ اگرچہ بالکل ایک فطری امر ہے، مگر میں اس کو بروقت نہیں بلکہ بہت بعد از وقت سمجھتا ہوں۔ کیونکہ یہ ردِعمل اُس وقت رونما ہوا ہے جب مسلم معاشرے کے اندر اس فتنے کو پرورش پاتے اور پروان چڑھتے ۸۰ ـ ۹۰ سال بیت چکے ہیں، اور اب اس کے استیصال کے لیے یہ آخری موقع ہمیں ملا ہے جس کو اگر ہم نے کھو دیا تو کچھ بعید نہیں کہ یہ فتنہ ہمیں لے ڈوبے گا۔ لاقدّر اللہ۔

درحقیقت اسلامی نقطۂ نظر سے یہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ بہت بڑی بات ہے کہ مسلمانوں کے درمیان کوئی شخص حضور خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کھلم کھلا نبوت کا دعویٰ لے کر اُٹھے اور اس کی دعوتِ باطل کو اسی مسلم معاشرے میں پھیلنے کا موقع حاصل ہوتا چلا جائے۔ یہ اتنا بڑا گناہِ عظیم ہے کہ اسے ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہ کیا جانا چاہیے تھا، کجا کہ اس کے معاملہ میں اس قدر تساہل برتا جاتا کہ وہ صدی کی آٹھ نو دہائیوں تک نہ صرف ہمارے ملک میں، بلکہ دوسرے مسلم اور غیر مسلم ملکوں میں بھی پھیلتا چلا جاتا۔ اس معاملہ میں ہم اُس دور کے لیے تو اللہ جل شانہٗ کے سامنے کچھ عذر پیش بھی کر سکتے ہیں جبکہ ہم پر انگریزی حکومت مسلط تھی، اور ہم اُس کے آگے بے بس تھے، اور وہ اِس فتنے کی آبیاری کر رہی تھی۔ لیکن انگریزوں سے آزاد ہونے کے بعد جب پاکستان کا اقتدار خود مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ اُس وقت ۲۷ سال تک اس فتنے کی آبیاری خود انگریزوں سے بھی بڑھ کر ہمارے مسلمان حکمرانوں

کے ہاتھوں ہونا، اور اس کو آتنی طاقت پکڑ جانے کا موقع دینا کہ وہ پاکستان کی حکومت پر قابض ہو جانے کا حوصلہ کرنے لگے، ایسا اکبر الکبائر ہے جس پر کوئی عذر ہم اپنے رب کے حضور پیش نہیں کر سکتے۔ اب اگر ہم اسی پچھلے طرز عمل کو جاری رکھتے ہیں تو خدا کے عذاب سے ہمیں کوئی طاقت نہیں بچا سکتی۔ اس لیے میں عام مسلمانوں سے بھی کہتا ہوں کہ جو تحریک اُنہوں نے اِس فتنۂ غلام احمدیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے شروع کی ہے اسے ایک قطعی فیصلے تک پہنچائے بغیر ہرگز نہ چھوڑیں، اور ملک کی حکومت اور قومی اسمبلی سے بھی کہتا ہوں کہ وہ خدا کے حضور اپنی جواب دہی کو یاد کریں، سیاسی اغراض و مصالح کو بھول جائیں اور پوری ایمانداری کے ساتھ وہ فیصلہ کریں جو عین ان کے دین و ایمان کے مطابق ہے۔

یہ معاملہ جو اس وقت اسمبلی میں زیر بحث ہے، اپنے اندر کوئی پیچیدگی نہیں رکھتا، بلکہ کھلے آسمان کی طرح صاف اور عیاں ہے۔ جس شخص کو دین کی معمولی واقفیت بھی حاصل ہو وہ جانتا ہے کہ اسلام میں نبوت ایک فیصلہ کن چیز ہے۔ اگر نبی سچا ہو اور کوئی اس کو نہ مانے تو کافر۔ اور اگر وہ جھوٹا ہو اور کوئی اسے مان لے تو کافر۔ بہرحال ایک دعوائے نبوت کے بعد یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ اُس کے ماننے والے اور اُس کا انکار کرنے والے ایک اُمّت میں جمع ہو سکیں۔ نبوت ایک سنگین دیوار ہے جو دونوں گروہوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے حائل ہو جاتی ہے اور انہیں نہیں ملنے دیتی جب تک کہ وہ منہدم نہ ہو جائے۔ ہر نبوت اپنے ماننے والوں کی ایک الگ اُمّت بناتی ہے اور نہ ماننے والوں کو قطعی طور پر ان سے جدا کر دیتی ہے۔

یہ تو ہے بجائے خود نبوت کی اُصولی حیثیت۔ لیکن اسلام میں اِس امر کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوّت کا دعویٰ لے کر اُٹھنے والا کوئی شخص سچا نبی ہو سکے۔ اس لیے کہ قرآنِ حکیم، احادیثِ صحیحہ اور اجماعِ امت کی رو سے حضورؐ اللہ کے آخری نبی ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے حضورؐ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے کسی شخص سے بھی یہ نہیں پوچھا کہ اس کے نبی ہونے کی دلیل کیا ہے بلکہ بالاتفاق اس کو جھوٹا مدعی قرار دے کر اُس سے اور اس کے ماننے والوں سے جنگ کی اور اُن کو وہ حقوق بھی نہیں دیے جو اسلامی قانون میں مسلح بغاوت کرنے والے مسلمانوں یا ذمیوں کو دیے جاتے ہیں۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کے دَور سے آج تک ۱۴ سو برس کی مدّت میں ہر زمانے کے مسلمان اس بات پر متفق رہے ہیں اور اس میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ہوا ہے کہ بعثتِ محمدیہ علی صاحبہا السلام کے بعد

نبوت کا دعویٰ کرنے والا ہر شخص جھوٹا ہے، کافر ہے، اور اس پر ایمان لانے والا بھی کافر ہے، حتٰی کہ ایسے مدعی سے اس کی نبوت کی دلیل پوچھنا بھی کفر ہے، کیونکہ دلیل پوچھنے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ کھلا سمجھ رہا ہے، اور اُسے کھلا سمجھنا بجائے خود قرآن و حدیث اور اجماع کی رو سے کفر ہے۔

اب دیکھیے۔ ایک طرف تو دعوائے نبوت بعد از خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اسلام کا یہ صریح اور مُتفق علیہ حکم ہے اور دوسری طرف یہ ناقابلِ انکار واقعہ ہے کہ مرزا غلام احمد نے نبوت کا دعویٰ کیا، اپنی نبوت تسلیم کرنے کی لوگوں کو دعوت دی، نہ ماننے والوں کو کافر قرار دیا، اور ماننے والوں کی ایک الگ اُمت بنائی جس کا کوئی فرد اپنے باپ کا جنازہ بھی نہیں پڑھ سکتا اگر وہ اس نئی نبوت پر ایمان نہ لایا ہو۔ سوال یہ ہے کہ یہ مدعی آخر سچا کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جب یہ سچا نہیں ہے تو اس کے کافر ہونے اور اس کی تصدیق کرنے والے سب لوگوں کے کافر ہونے میں شک کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے؟ اور اس نئے نبی کی یہ اُمت مسلمانوں ہی کے اندر کا ایک فرقہ کیسے قرار پا سکتی ہے جبکہ وہ اسلام کی سرحد توڑ کر خود اس سے باہر نکل چکی ہے؟

لیکن یہ اِس نئی امت اور اِس کے بانی مدعیِ نبوت کی انتہائی چالاکی ہے کہ اس نے اسلام کی سرحد سے نکل کر بھی اپنے دین کو اصل اسلام قرار دیا، اسلام ہی کے نام سے اس کی تبلیغ کی، اور لاکھوں مسلمانوں کو اِس گمراہی میں مبتلا کیا کہ کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ کے قائل ہوتے ہوئے بھی وہ کافر رہتے ہیں جب تک کہ مرزا غلام احمد کی نبوت کا کلمہ اس کے ساتھ نہ ملائیں۔ اگر یہ لوگ سیدھی طرح اسلام سے نکل کر کسی دوسرے نام سے اپنی الگ اُمت بنا لیتے اور اپنے آپ کو مسلمان نہ کہتے تو اتنا بڑا فتنہ نہ بنتے جتنا بڑا فتنہ وہ اُمت در اُمت کی صورت اختیار کر کے بن گئے ہیں۔ وہ اپنے مذہب کا کوئی دوسرا نام رکھ کر اُس کی تبلیغ کرتے تو کسی ایک مسلمان کو بھی اس بات پر آمادہ نہ کر سکتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی چھوڑ کر مرزا غلام احمد کی پیروی قبول کر لے۔ وہ نہ انگریزی حکومت کے دور میں مسلمانوں کے حقوق کا بڑا حصہ ہتھیا سکتے تھے، اور نہ پاکستان قائم ہونے کے بعد انہیں یہ موقع مل سکتا تھا کہ حکومت کے نظم و نسق اور اس کی مسلح افواج اور اس کے زیر اثر معاشی زندگی کے ہر شعبے میں پھیلتے اور بڑھتے چلے جاتے۔ مگر یہ ان کی انتہائی عیاری تھی کہ انہوں نے مسلمانوں کو کافر قرار دے کر ان سے الگ اپنی امت بھی منظم کی، اور پھر

مسلمانوں کی اُمت میں شامل رہ کر وہ سرطان کے پھوڑے کی طرح جسدِ ملت میں اپنی جڑیں بھی پھیلاتے رہے۔ یہ ان کی اِسی عیاری کا نتیجہ ہے کہ انہیں مسلمانوں کا ایک فرقہ سمجھا جاتا رہا۔ مسلمانوں کو توڑ توڑ کر وہ اپنی امت میں ملاتے اور اپنی تعداد بڑھاتے رہے۔ اور ایک منظم طریقے سے پیہم کوشش کر کے وہ مسلم معاشرے اور حکومت پر اِس طرح چھاتے چلے گئے کہ اب وہ پاکستان کے حکمران بن جانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

ربوہ کا حادثہ اِسی پس منظر میں پیش آیا ہے اور یہ گویا مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آخری تنبیہ ہے کہ اگر ان میں کچھ بھی دینی حس باقی ہے تو امت محمدیہ کے اندر اُمتِ غلام احمدیہ کے پھلنے پھولنے کا ہر راستہ بند کر دیں۔ ہزار ہزار شکر ہے اس خداوند عظیم کا کہ اس تنبیہ پر پاکستان کے علما و مشائخ، سیاسی لیڈر اور عام مسلمان بھی پوری طرح بیدار ہو گئے، اور حکومت بھی بروقت اس کی طرف متوجہ ہو گئی جیسا کہ صمدانی ٹریبونل کے قیام، مسٹر بھٹو کی ۱۳ ؍جون والی تقریر اور پوری قومی اسمبلی کے ایک کمیٹی کی صورت میں اس مسئلے کے حل کی کوشش میں لگ جانے سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس موقع پر میں چند ضروری تجاویز پیش کرتا ہوں جن سے میرے نزدیک یہ مسئلہ بخوبی حل کیا جا سکتا ہے۔

۱- میری پہلی تجویز یہ ہے کہ پاکستان کے دستور کی دفعہ ۲ میں، جو ریاست کا مذہب اسلام قرار دیتی ہے، حسب ذیل دو شِقوں کا اضافہ کیا جائے:

(۱) اللہ کی توحید، تمام انبیاء کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری نبی ماننا، تمام کتبِ الٰہیہ کے بعد قرآن مجید کو اللہ کی آخری کتاب تسلیم کرنا اور آخرت پر ایمان رکھنا اسلام کے لازمی بنیادی عقائد ہیں جن میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔

(۲) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص نبی ہونے کا دعویٰ کرے، اور ایسے مدعی کو جو شخص اپنا مذہبی پیشوا مانے وہ کافر اور خارج از اسلام ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ مدعی خود اپنے آپ کو، یا اس کے پیرو گروہ اس کو ظلی یا بروزی یا اُمتی یا غیر تشریعی نبی کہے، یا مسیح موعود، مجدد، محدث وغیرہ ناموں سے یاد کرے۔

۲- میری دوسری تجویز یہ ہے کہ دستور کی دفعہ ۱۰۶ کی شق (۳) میں جہاں اقلیتوں کا ذکر ہے، وہاں بدھ مت والوں کے بعد "مرزا غلام احمد قادیانی کے پیرووں" کا اضافہ کر دیا جائے۔

۳۔ میری تیسری تجویز یہ ہے کہ دفعہ ۶ شق (۱) کے بعد حسب ذیل شق (۲) کا اضافہ کر کے بقیہ شقوں کو ان دونوں شقوں کے مطابق کر دیا جائے:

"کوئی شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو اور اس کے باوجود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے، یا ایسا دعویٰ کرنے والے کو اپنا مذہبی پیشوا مانے، یا لوگوں کو اُسے مذہبی پیشوا ماننے کی دعوت دے، یا اسے نہ ماننے والوں کو کافر قرار دے، وہ بھی خیانت عظمیٰ (HIGH TREASON) کا مرتکب سمجھا جائے گا۔"

ان ترمیمات سے دستور کی حد تک نئی نبوت کے فتنے کا کما حقہ سدباب ہو جاتا ہے۔ میری تجویز کردہ ان دستوری ترمیمات پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ دستور جیسی دستاویز میں کسی شخصِ خاص کا نام لینا مناسب نہیں ہے۔ ہمارا دستور قرآن سے زیادہ مقدس تو نہیں ہو سکتا۔ اس میں جب ابولہب کا نام لیا گیا ہے تو ہمارے دستور میں مرزا غلام احمد کا نام لینا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ بخصوصاً جب کہ قادیانی مسئلے کو حل کرنے کے لیے اس گروہ کے بانی کا نام لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ قومی اسمبلی ایک قرارداد کے ذریعہ سے حکومت کو حسبِ ذیل تدابیر جلدی سے جلدی اختیار کرنے کا مشورہ دے:

(۱) تمام ملازمینِ حکومت سے ایک ڈیکلریشن فارم پُر کرایا جائے جس میں ہر ملازم یہ واضح کرے کہ وہ مرزا غلام احمد کو اپنا مذہبی پیشوا مانتا ہے یا نہیں۔

(۲) جو شخص غلط ڈیکلریشن دے اس کی غلط بیانی جس وقت بھی ظاہر ہو اسی وقت اس کو ملازمت سے الگ کر دیا جائے اور اس کے تمام حقوق جو سرکاری ملازمت کی بنا پر اسے حاصل ہوں، ساقط کر دیے جائیں، اور اس کو آئندہ ہر ملازمت کے لیے نااہل قرار دے دیا جائے۔

(۳) رائے دہندوں کی فہرست اور مردم شماری میں پیروان مرزا غلام احمد کا خانہ علیٰحدہ رکھا جائے۔

(۴) شناختی کارڈوں اور پاسپورٹوں میں بھی مرزا غلام احمد کے پیروؤں کے لیے ان کے نام ساتھ ان کے مذہب کی تصریح کی جائے۔

(۵) تمام کلیدی اسامیوں سے اس گروہ کے افراد کو ہٹا دیا جائے۔

(۶) سرکاری ملازمتوں میں اس گروہ کے لوگوں کا تناسب ان کی آبادی کے مطابق کر دیا جائے اور تناسب سے بہت زیادہ مناصب اُن کو دے کر مسلمانوں کے ساتھ جو بے انصافی کی جاتی رہی ہے اس کا تدارک کیا جائے۔

(۷) ربوہ کی زمین جن شرائط پر انہیں دی گئی ہے ان پر نظر ثانی کی جائے اور مفادِ عامہ کو ملحوظ رکھ کر از سر نو شرائط مقرر کی جائیں۔ نیز اگر یہ ثابت ہو کہ انہوں نے گرانٹ کی شرائط کی خلاف ورزی کی ہے تو اس گرانٹ کو منسوخ کر دیا جائے۔

(۸) ربوہ کو جسے انہوں نے ریاست در ریاست بنا رکھا ہے کھلا شہر قرار دیا جائے۔ اور وہاں مسلمانوں کو جائداد حاصل کرنے، سکونت اختیار کرنے یا کاروبار کرنے کے پورے مواقع دیے جائیں۔

ایسی قرارداد پاس ہونے کے بعد اگر حکومت اس پر مستعدی کے ساتھ انتظامی کارروائی کرے تو ملک بہت جلد اُن خطرات سے محفوظ ہو سکتا ہے جو اس فتنے کے ۸۰ ۔ ۹۰ سال تک پروان چڑھتے رہنے سے اب علانیہ رونما ہو رہے ہیں۔

اس کے علاوہ میں وزیر اعظم صاحب سے دو گزارشیں اور کروں گا۔ ایک یہ کہ صمدانی ٹریبونل کی رپورٹ کو بلا کم و کاست شائع کریں۔ دوسرے یہ کہ ختم نبوت کی تحریک پر جو بے جا پابندیاں ملک میں لگائی گئی ہیں، جو گرفتاریاں اس تحریک کو روکنے کے لیے عمل میں لائی گئی ہیں، اور پریس کا گلا گھونٹنے کے لیے جو کچھ کیا گیا ہے، اِس پورے سلسلے کو انہیں فوراً ختم کر دینا چاہیئے، کیونکہ یہ سب کچھ ان کی ۱۳ رجون والی تقریر کی روح اور معنی کے بالکل خلاف ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

رسائل و مسائل

تعلیمِ قرآن اور خدماتِ دینیہ پر اُجرت کا جواز و عدم جواز

(۲)

ملک غلام علی

سوال:- جون کے ترجمان القرآن میں تعلیم قرآن پر معاوضہ لینے کے جواز میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے تسلی نہیں ہوئی۔ آپ نے لکھا ہے کہ متاخرین حنفیہ کا اس کے جواز پر اتفاق ہے۔ لیکن مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ متاخرین کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور متقدمین کہاں ختم ہوتے ہیں۔ پھر آپ نے ائمہ سلف کے حوالے سے بھی یہی بات لکھ دی ہے کہ سب اجرت کے جواز کے قائل ہیں۔ سلف اور متقدمین کا مفہوم و مطلب آپ کے نزدیک کیا ہے۔

میرے پیش نظر اس وقت احکام القرآن، جصاص ہے۔ اس کے جزء ثانی ص ۵۲۶ طبع مصری، باب الرشوہ میں فرماتے ہیں:

هٰذا دلیل ان کل ما کان مفعولاً علی وجه الفرض والقربة الی الله انه لا یجوز اخذ الاجرة علیه کالحج وتعلیم القرآن والاسلام......

(اس سے دلیل ملتی ہے کہ جو کام فرض ہو یا جس سے مقصود تقرب الٰہی کا حصول ہو، اس پر اجرت لینا جائز نہیں، مثلاً حج اور قرآن و اسلام کی تعلیم وغیرہ)۔

آپ واضح کریں کہ احکام القرآن کے مصنف متقدمین میں سے ہیں یا متاخرین میں سے، اور دوسروں کے مقابلے میں ان کا اور ان کی رائے کا کیا درجہ و مقام ہے؟

آپ نے امام ابوحنیفہ کی رائے کے مقابلے میں صرف شامی کا ایک حوالہ دیا ہے جو امام صاحب کے قول پر بھاری نہیں ہو سکتا۔ دوسرا آپ کا استدلال دوسرے رنگ میں ہے جس میں حنفی مسلک

کی روشنی میں بحث نہیں کی گئی۔ لیکن اس سے اس سوال کا جواب نہیں مل سکتا کہ اس خاص معاملے میں حنفیہ کا فتویٰ کیا ہے جس کے مطابق عمل ہونا چاہیے۔ اس لحاظ سے اس کی دوبارہ وضاحت ضروری ہے۔

جواب :- مجھے بھی یہ معلوم ہے کہ علامہ ابوبکر الجصاص اور ان کے پیشرو اور متقدم احناف کا فتویٰ یہی تھا کہ تعلیم قرآن کی اجرت جائز نہیں۔ الجصاص کا سن وفات ۳۷۰ھ ہے۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے، اسی دور یعنی چوتھی صدی کے اواخر میں بعض فقہائے حنفیہ نے فتوے میں تبدیلی کرتے ہوئے پہلے ائمہ سے مختلف رائے ظاہر فرمائی ہے۔ فتاویٰ قاضی خاں میں حافظ ابواللیث سمرقندی کا قول یوں درج ہے:

قال کنت افتی ان لا یحل للمعلم اخذ الاجرۃ علی تعلیم القرآن ..... فرجعت عن ذٰلک۔

(امام ابواللیث نے فرمایا کہ میں پہلے فتویٰ دیتا تھا کہ معلم کے لیے تعلیم قرآن پر اجرت لینا جائز نہیں مگر میں نے اس رائے سے رجوع کر لیا ہے)۔

فقیہ ابواللیث ابوبکر جصاص کے ہم عصر ہیں اور ان کا انتقال ۳۷۳ھ میں ہوا ہے۔ قاضی خان بھی (جن کا پورا نام فخرالدین حسن بن منصور ہے) جواز کے حق میں اپنا فتویٰ دیتے ہیں اور ان کا سنِ وفات ۵۹۲ھ ہے۔ امام برہان الدین المرغینانی صاحب ہدایہ ایک سال بعد ۵۹۳ھ میں فوت ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہدایہ کتاب الاجارہ میں عدمِ جواز کا قول نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

بعض مشائخنا استحسنوا الاستیجار علی تعلیم القرآن الیوم لانہ ظھر التوانی فی الامور الدینیہ ففی الامتناع تضییع حفظ القرآن وعلیہ الفتوی

(ہمارے بعض مشائخ نے تعلیم قرآن پر اجرت لینے کو استحساناً آج کل جائز قرار دیا ہے کیونکہ اب دینی امور میں سستی اور تساہل پیدا ہو گیا ہے اور اگر تعلیم قرآن پر اجرت کی ممانعت کر دی جائے، تو حفاظت قرآن ناممکن ہو جائے گی اور اسی قول پر فتویٰ ہے)۔

امام اکمل الدین (ف۔ ۷۸۶ھ) ہدایہ کی شرح عنایہ میں اس مقام پر فرماتے ہیں:

انما کرہ المتقدمون ذٰلک لانہ کان للمعلمین من بیت المال عطیات فکانوا مستغنین عما لابد لھم من امر معاشھم وقد کان فی الناس رغبۃ

فی التعلیم بطریق الحسبۃ ولم یبق ذٰلک۔

(متقدمین نے اجرت لینا اس لیے ناجائز قرار دیا تھا کہ معلّمین کے بیت المال سے وظائف مقرر تھے اور وہ اپنی معاشی ضروریات سے بے نیاز تھے، نیز لوگوں میں یللہ فی اللہ تعلیم کی رغبت تھی جواب ناپید ہے)۔

ابوالبرکات النسفی (ف۔ ۷۱۰ھ) کنزالدقائق میں اجارہ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والفتوی الیوم علی جواز الاستیجار لتعلیم القرآن۔

(آج کل تعلیم قرآن پر اجرت کے حق میں جواز کا فتویٰ ہے)۔

کنزالدقائق کی شرح میں امام معین الدین ہروی (ملامسکین) فرماتے ہیں:

وکذلک یفتی الیوم بجواز الاجارۃ علی تعلیم القرآن والفقہ۔ قال مشائخنا یجبر الاب علیٰ دفع الاجر الی الاستاذ وقال الامام ابومحمد خیزاخزی یجوز فی زماننا الامام وللمؤذن وللمعلم اخذ الاجر کذا فی الذخیرۃ والروضہ۔

(اسی طرح آج کل قرآن و فقہ کی تعلیم پر اجرت لینے کے جواز پر فتویٰ ہے۔ ہمارے مشائخ نے فرمایا ہے کہ متعلم کے والد کو مجبور کیا جائے کہ وہ استاد کو تعلیم کا معاوضہ ادا کرے اور امام ابومحمد خیزاخزی نے فرمایا کہ ہمارے زمانے میں امام، مؤذن اور معلّم کے لیے تعلیم دینی پر اجرت حاصل کرنا جائز ہے۔ ذخیرہ اور روضہ میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے)۔

شرح وقایہ میں ہے:

لما وقع الفتور فی الامور الدینیۃ یفتی الیوم بصحتہا لتعلیم القرآن والفقہ تحرزاً عن الاندراس۔

(جب دینی امور میں سستی واقع ہوگئی تو آج کل قرآن و فقہ کی تعلیم پر اجرت کے جواز کا فتویٰ دیا جاتا ہے تاکہ ان علوم کو ضائع ہونے اور مٹنے سے بچایا جاسکے)۔

علامہ محمد علاءالدین الحصکفی (ف۔ ۱۰۸۸ھ) الدرالمختار میں فرماتے ہیں:

ویفتی الیوم بصحتہا لتعلیم القرآن والفقہ والامامۃ والاذان ویجبر

المستاجر علی الدفع ما قیل

(موجودہ حالات میں تعلیم قرآن و فقہ اور امامت و اذان کی اجرت کے جواز کا فتویٰ ہے اور مساجد کو مقرر اجرت ادا کرنے پر مجبور کیا جائے گا)۔

امام ابن عابدین شامی (ف - ۱۲۹۲ھ) نے الرد المحتار (شرح الدر المختار) میں اس مقام کی شرح کرتے ہوئے شیخ خیرالدین رملی، امام زیلعی اور دوسرے فقہاء کا یہ متفق علیہ قول نقل کیا ہے۔

لولم یفتح لھم باب التعلیم بالاجرۃ لذھب القرآن فافتوا بجوازہ ورأوہ حسنا۔

(اگر تعلیم قرآن پر اجرت کو جائز قرار نہ دیا جاتا تو قرآن مجید کی تعلیم مٹ جاتی پس فقہاء نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا اور اسے پسندیدہ قرار دیا)۔

فتاویٰ عالمگیری میں قائلین جواز کی تائید کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:

والمختار الفتویٰ فی زماننا قول ھؤلاء

(قابل ترجیح مسلک ہمارے زمانے میں انہی علماء کا ہے جنہوں نے جوازِ اجرت کا فتویٰ دیا ہے)۔

آپ کے اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے کہ متقدمین کہاں ختم ہوتے ہیں اور متاخرین کہاں سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ بالعموم طول بحث سے بچنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور اضافی اصطلاحات کے طور پر مروج ہیں۔ ہر پہلے آنے والا بعد والے کے لیے متقدم ہے اور ہر بعد میں آنے والا پہلے سے متاخر ہے۔ جہاں تک ائمہ فقہاء کا تعلق ہے، ان کے سات طبقات بیان کیے جاتے ہیں۔ پہلا طبقہ ائمہ مجتہدین کا ہے، مثلاً مذاہب فقیہہ کے ائمہ اربعہ یا دوسرے ائمہ سلف جنہوں نے کتاب و سنت سے قواعد و اصول اخذ کیے ہیں اور اجماع یا قیاس کی روشنی میں فروعی احکام کے استنباط کا آغاز فرمایا ہے۔ احناف کے طبقہ ثانیہ کو مجتہدین فی المذہب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جن میں امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور امام ابوحنیفہؒ کے دوسرے اصحاب و رفقاء شامل ہیں۔ یہ حضرات اصولی قواعد میں تو امام ابوحنیفہؒ کے پیرو ہیں لیکن کتاب و سنت اور اجماع و قیاس کی روشنی میں یہ اپنے استاد کے مقرر کردہ قواعد کے مطابق احکامِ فقیہہ کا خود بھی استخراج کرتے ہیں اور اس میں بعض اوقات ان کا قول امام صاحب سے یا آپس میں مختلف ہوتا ہے۔ تیسرا طبقہ مجتہدین فی المسائل کا ہے اور یہ ان مسائل میں اجتہاد کرتے ہیں جن میں امام ابوحنیفہؒ اور

ان کے شاگردوں کا کوئی فتویٰ موجود نہ ہو۔ امام ابوجعفر طحاوی، ابوالحسن کرخی شمس الائمہ سرخسی، فخرالاسلام بزدوی، قاضی خان وغیرہم کا شمار اسی طبقہ میں ہے۔ یہ صاحبِ مذہب کے طے کردہ اصول و قواعد کی روشنی میں ان مسائل پر رائے دیتے ہیں جو غیر منصوص و غیر منقول ہوں۔ چوتھا طبقہ اصحابِ تخریج کا ہے اور جن میں ابوبکر الجصاص اور ان کے ہم عصر شامل ہیں۔ اس طبقے اور اس کے مابعد طبقات کو عموماً مجتہدین کے بجائے مقلدین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن ان کے اقوال و آراء کو بغور دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات کو اگرچہ علی الاطلاق اجتہاد کا دعویٰ نہیں ہے لیکن وہ عمل اجتہاد سے بالکل عاری بھی نہیں ہیں۔ وہ بعض اوقات اپنے اساتذہ کے مجمل اور ذوالوجوہ قول کی تفصیل بیان کرتے ہیں اور مختلف احتمالات کی توضیح کرتے ہوئے کسی ایک پہلو یا احتمال کو دلائل شرعیہ اور قواعد ائمہ کے زیادہ مطابق قرار دیتے ہیں یا زمانے اور حالات کے تغیر کو سامنے رکھ کر فتوے میں تبدیلی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح پانچواں طبقہ اصحابِ ترجیح کا ہے جن میں ابوالحسن قدوری، برہان الدین مرغینانی (صاحبِ ہدایہ) وغیرہ شامل ہیں۔ یہ حضرات بھی اقوال سابقہ میں سے بعض کو ترک اور بعض کو اختیار کرتے ہیں اور جو مسئلہ عوام الناس کے لیے باعث سہولت ہو اور اس سے اصول اولیہ کا تصادم بھی نہ ہو، اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ چھٹا طبقہ اصحابِ تمیز کا ہے جو متقدمین کی روایات میں سے قوی و ضعیف اور ظاہر و نادر کا فرق پہچانتے ہیں اور زیادہ مستند اور ثابت اقوال کو چھانٹ کر جمع کرتے ہیں۔ کنز الدقائق، درمختار، وقایہ کے مصنفین کا شمار اسی گروہ میں ہے۔ انہوں نے مردود و ضعیف اقوال ائمہ کو ترک کر کے مشہور اقوال پر انحصار کیا ہے۔ ساتویں اور آخری طبقے میں جو حضرات شامل ہیں ــــ انہیں بھی جامد اور اندھے بہرے مقلد سمجھنا درست نہیں ہے ــــ انہوں نے بالعموم مستقل تصانیف نہیں لکھیں لیکن پہلی کتابوں کے متون پر انہوں نے ایسے حواشی اور شروح کا اضافہ کر دیا ہے کہ ان سے پہلی کتابوں کے مسائل آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں اور کوئی طالب علم ان کو نظر انداز کر کے کتب سابقہ سے استفادہ و استنباط نہیں کر سکتا۔

بہرکیف ان بزرگوں کی ہر نسل و قرن اپنے پیشروؤں سے متاخر اور اپنے جانشینوں سے متقدم ہے۔ ان کی کسی ایک صف کے آگے خط کھینچ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے پہلے جو آچکے ہیں وہ متقدمین تھے اور بعد میں آنے والے متاخرین ہیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمارے لیے سب متقدم اور سلف صالح کا درجہ رکھتے ہیں۔ پھر دوسرے ائمہ و محدثین جو شروع ہی سے اس مسئلہ میں جواز کے قائل ہیں، وہ بھی ہمارے اسلاف ہی ہیں۔ اس لیے میں نے اگر یہ کہا ہے کہ علمائے سلف کا اس پر قریب قریب اتفاق ہو چکا ہے تو یہ بات غلط نہیں ہے۔ امام ابوبکر الرازی (الجصاص) کی رائے پر مزید اظہار خیال ضروری و مناسب خیال نہیں کرتا جبکہ میں نے دیگر احناف کی تحقیق نقل کر دی ہے۔ ❖

مطبوعات

اساسیات اسلام

تالیف :۔ مولانا محمد حنیف ندوی

شائع کردہ :۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ، لاہور

قیمت :۔ ۱۰/۵۰ روپے صفحات ۲۴۸

زیر تبصرہ کتاب کے فاضل مصنّف پاک و ہند کے علمی اور دینی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ امام غزالیؒ، ابن خلدون، علامہ ابوالحسن اشعریؒ اور امام ابن تیمیہؒ پر انہوں نے جس نئے انداز سے کام کیا ہے وہ اہلِ نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اساسیات اسلام ان کی نئی تصنیف ہے جس میں انہوں نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں فرد اور معاشرہ کے فکری اور تہذیبی مسائل کا تجزیہ اور حل پیش کیا ہے۔

ہمارے نزدیک اس کتاب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ مولٰینا نے جدید ذہن اور جدید فلسفے کو سامنے رکھتے ہوئے نئے اور ٹھوس استدلال اور علمی اندازِ بیان کے ساتھ اسلام کی اساسی تعلیمات سے بحث کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے اسلام کے بعض بنیادی تصوّرات بڑے سلجھے ہوئے انداز میں اُجاگر کیے ہیں ــ مثلاً اسلام میں عقیدہ توحید اور معاشرے پر اُس کے اثرات ۔ پھر انہوں نے فنون لطیفہ کے ذیل میں رقص اور مجسمہ سازی کی حرمت جن عقلی دلائل کے ساتھ ثابت کی ہے وہ بھی قابلِ قدر ہے۔ مگر ہم افسوس کے ساتھ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ فاضل مصنّف نے کتاب میں بعض ایسی باتیں بھی کی ہیں جو محل نظر ہیں اور بعض تو ایسی ہیں جن سے کسی صورت بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا نے اپنی گفتگو کا آغاز وقت کے تقاضوں سے کیا ہے اور ان تقاضوں کی ہیبت اس طرح دل پر نقش کرنے کی کوشش کی ہے جس طرح کہ تجدّد پسند حضرات بالعموم کرتے ہیں جیسے کہ یہ تقاضے کوئی ازلی و ابدی حقائق ہیں جنہیں جوں کا توں تسلیم کیے بغیر اور اسلامی تعلیمات کو موڑ توڑ کر ان سے ہم آہنگ کیے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ غالباً یہ ان تقاضوں سے شدید مرعوبیت کا نتیجہ ہے کہ مولانا بھی عصری تقاضوں

کے بعض دوسرے نقیبوں کی طرح قرآن مجید کا اس طرح ذکر فرماتے ہیں، گویا کہ تنہا کتاب الٰہی ہی شریعت اسلامی کا ماخذ ہے۔

پھر انہوں نے عورت کے بارے میں فطرت کے جس فیصلے کا ذکر فرمایا ہے وہ بھی صحیح نہیں کیا۔ عورت کی عظمت اس بات میں مضمر نہیں کہ وہ زندگی کے ہر دائرے میں مرد پر سبقت لے جانے کی کوشش کرے۔ فطرت نے اُسے بعض دوسرے دوائر میں جدوجہد کرنے کے لیے پیدا کیا ہے اور وہیں اس کی جدوجہد کار آمد نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

یوں تو پوری کتاب میں تجدد پسندی کا رنگ غالب ہے لیکن ہمارے نزدیک اس کا سب سے کمزور حصّہ وہ ہے جس میں اسلام کے اقتصادی مؤقف پر بحث کی گئی ہے۔ سوشلزم کے بارے میں مولانا کا مؤقف یہ ہے کہ یہ اپنے ریاضیاتی مزاج کے اعتبار سے نہ اسلامی ہے نہ غیر اسلامی۔ یہ ایک سائنس ہے "جس کا تعلق تقسیم دولت کے ایک خاص طریق سے ہے" لیکن اگلا فقرہ تحریر کرتے ہوئے وہ غالباً اپنے اس قول کو بھول جاتے ہیں اور پھر یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کی بنیاد اور اساس میں جدلی مادیت کا تصور کار فرما ہے۔ اشتراکیت تقسیم دولت کا صرف ایک شعبہ نہیں بلکہ ایک کلیّت پسند ضابطہ حیات ہے جو اساسی تصورات سے لے کر جزئیات اور فروعات تک جدلی مادیت کے فلسفے سے عبارت ہے۔ اس لیے اسلام کے ساتھ اس کی پیوندکاری نہیں کی جا سکتی، مگر مولانا اشتراکیّت کی اقتصادی روح کو اسلامی فکر میں سمو دینے کے لیے شدید آرزومند نظر آتے ہیں۔

مولانا کے نزدیک معاشی ناہمواریوں کا ایک ہی حل ہے کہ ذرائع پیداوار کو حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے تاکہ وہ ملی مصالح کے تحت ان سے فائدہ اُٹھائے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر چند سرمایہ دار محدود سے ذرائع پیداوار پر قابض ہوتے ہوئے عوام کے لیے جینا دُوبھر کر سکتے ہیں تو آخر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ پوری ملت کے وسائل پر قابض افراد لازمی طور پر عوام کی خیر اور بھلائی ہی سوچیں گے۔ ایک نامور فلسفی نے بالکل صحیح کہا ہے کہ دنیوی چیزوں میں انسان سب سے زیادہ طاقت کا حریص ہوتا ہے اور یہی چیز اس کے اندر سب سے زیادہ بگاڑ پیدا کرتی ہے۔ وہ دولت بھی اس لیے چاہتا ہے کہ یہ طاقت کے حصول کا مؤثر ذریعہ ہے۔ اب آپ اگر ایک ایسا معاشرہ قائم کر دیتے ہیں جس میں ذرائع پیداوار حکومت کی تحویل میں ہونے کی وجہ سے عوام ایک ایک لقمے کے لیے کارپردازانِ حکومت کے محتاج ہوں اور

ملت کے یہ سربراہ اس غیر مسؤل اقتدار کے نشہ میں بدمست ہوکر عوام کو ظلم وستم کا تختۂ مشق بنانا شروع کردیں تو پھر ان بیچاروں کی نجات کی صورت کیا ہوگی۔ کیا ضمیر کی آزادی کے لیے یہ ضروری نہیں کہ انسان کی معیشت بھی آزاد ہو۔

پھر مولانا جیسے فاضل اور بیدار مغز عالم سے یہ بات بھی پوشیدہ نہیں کہ دَور جدید میں حکومت کے اختیارات اس قدر وسیع ہو گئے ہیں کہ وہ ذرائع پیداوار پر قبضہ کیے بغیر معاشی ناہمواریوں کو جس طرح چاہے محدود کرسکتی ہے اور جس سطح پر چاہے عوام کی بنیادی ضروریات پوری کرنے پر قدرت رکھتی ہے۔

مولانا نے اسی باب میں غلامی کا ذکر کرتے ہوئے جس روشن ضمیر عالم پر "معذرت پسند متکلم" کی چوٹ کی ہے وہ بھی صحیح نہیں۔ روشن ضمیر متکلم نے غلامی کے بارے میں وہ بات نہیں کی جو اس کی طرف منسوب کی جارہی ہے۔ آج بھی اگر جنگی قیدیوں کے تبادلے کا بین الاقوامی قانون ختم ہو جائے تو پھر متعدد دوسری تدابیر کے علاوہ غلامی بھی قابل غور حل ہی متصور ہوگا۔

"اساسیات اسلام" میں ہمیں چند بنیادی عنوانات کی عدم موجودگی شدت سے کھٹکتی ہے۔ اگر توحید باری کا ذکر اساسیات اسلام میں سے ایک اساس ہے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ختم المرسلینی پر ایمان بھی اسلام کی ایک اساس ہی ہے۔ اسی طرح اگر نماز کا تذکرہ ضروری ہے، تو صوم، زکوٰۃ اور حج کا ذکر بھی اسی طرح ضروری ہے۔ ہمیں امید ہے کہ فاضل مصنف اس کتاب کی اشاعت ثانی کے وقت ہماری ان معروضات کو نگاہ میں رکھیں گے۔

(بقیہ اشارات) تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ حق نے باطل کے بارے میں یا باطل نے حق کے بارے میں مصالحانہ رویہ اختیار کر لیا ہے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ آغاز میں باطل حق کی قوت کا بخوبی اندازہ نہیں کر سکتا اور وہ اسے ایک ناقابل التفات سی چیز سمجھ کر تھوڑے سے عرصے کے لیے نظر انداز کر دیتا ہے یا پھر حق کے علمبرداروں میں وہ انقلابی رُوح مفقود ہوتی ہے جس سے باطل لرزتا اور خوفزدہ ہوتا ہے۔

آپ اس نیم براعظم کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو بیسیوں ایسی مثالیں مل جائیں گی جن سے آپ کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا کہ باطل حق کے خطرات کی کس ذہانت کے ساتھ پیش بینی کرتا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کسی تخت و تاج کے اُمیدوار اور دعویدار نہ تھے۔ ایک مرد درویش تھے جو مسلمانوں کو ان کا بھولا بسرا سبق یاد دلانے میں اپنی توانائیاں صرف کر رہے تھے۔ تقسیمِ اقتدار کے معاملے میں بھی ان کا کسی سے کوئی جھگڑا نہ تھا مگر اُن کی غیر سیاسی شخصیت اور غیر سیاسی سرگرمیوں کے باوجود اقتدار اُن کے وجود کو گوارا نہ کر سکا۔ وجہ ظاہر ہے کہ اُن کی شخصیت اگرچہ غیر سیاسی تھی مگر اصحابِ اقتدار کی نظر میں اُن کی دعوت اور پیغام کا مزاج انقلابی تھا اور اُنہیں اس بات کا شدید خطرہ لاحق تھا کہ اس پیغام کو اگر عوام نے قبول کر لیا تو پھر ان کی بادشاہت کا تخت جوں کا توں بچا نہ رہ سکے گا بلکہ اس میں بہت کچھ تبدیلیاں کرنی پڑیں گی جو انہیں کسی صورت بھی گوارا نہ ہوں گی۔

مسلمانوں میں آج تک جن حضرات نے بھی سیاست کے دائرے سے الگ رہ کر دینِ حق کو سربلند کرنے کی کوششیں کی ہیں ان کی جدوجہد کے دو نتائج ہی ہمارے سامنے آئے ہیں۔ ان میں سے اگر ایک کو حسرتناک انجام کہا جا سکتا ہے تو دوسرے کو المناک اختتام۔ پہلی نوعیت کے انجام سے وہ سادہ لوح بزرگ دوچار ہوتے جو یہ سمجھتے رہے کہ اگر ہم اقتدار سے تعرض نہ کریں تو اقتدار بھی ہماری راہ میں حائل نہ ہوگا۔ لیکن جس وقت انہوں نے اقتدار کے تیور بدلتے دیکھے تو جلد ہی اُن کی یہ خوش فہمی دُور ہو گئی۔ وہ تو سیاست کی خارزار وادی سے دامن بچا کر قدم اُٹھاتے رہے مگر اصحابِ اقتدار اس امر کا جائزہ لیتے رہے کہ اُن کی سرگرمیاں اقتدار کے لیے کس حد تک مفید اور ضرر رساں ہیں اور جونہی انہیں اس امر کا احساس ہوا کہ اُن کی ان سرگرمیوں

کے نتیجے میں عوام کے اندر یہ احساس بیدار ہو رہا ہے کہ جب تک اقتدار کا مزاج اور اس کی نوعیت تبدیل نہ ہو اس وقت تک کسی گوشہ زندگی میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں لائی جا سکتی، تو اس وقت اصحابِ اقتدار نے ان سرگرمیوں پر قدغن لگانے کی کوشش کی اور اس طرح اصحابِ اقتدار اور غیر سیاسی مصلحین کے مابین آویزش شروع ہو گئی جس سے یہ نیک دل لوگ بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن اس نازک مرحلے پر ان بزرگوں کو مصیبت پیش آئی کہ جن لوگوں کو وہ برسوں سے سیاست سے دامن کش رہنے کی تربیت دے رہے تھے وہ اس کشمکش میں اپنے آپ کو جھونکنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دینِ حق کے یہ مخلص علمبردار اپنے اخلاص کے باوجود باطل کی ایک چوٹ بھی نہ کھا سکے اور اپنے کیے کرائے پر خود ہی پانی پھیر دیا۔

دین کے خدمت گزاروں کا دوسرا گروہ ان حضرات پر مشتمل رہا ہے جو مسلمانوں کے لیے بعض دنیوی فوائد حاصل کرنے کو ہی اسلام کی بڑی خدمت تصور کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے غلطی سے یہ فرض کر لیا کہ وہ جب تک اصحابِ اقتدار کو اپنی وفاداری کا یقین نہیں دلا لیتے اس وقت تک وہ قوم کی کوئی نمایاں خدمت سرانجام نہیں دے سکتے۔ چنانچہ انہوں نے بڑے طمطراق سے یہ اعلان کیا کہ وہ سیاست سے بالکل الگ رہ کر دینِ حق کی خدمت کریں گے اور انہوں نے غیر سیاسی دائرہ میں ایک خاص نہج پر اس خدمت کا آغاز بھی کیا لیکن چونکہ انہوں نے اپنے کام کا نقشہ اس طرح تیار کیا تھا کہ اقتدار سے آویزش کے بجائے مصالحت اور سازگاری پیدا ہو اس لیے خدمتِ دین کے زعم میں وہ باطل نظامِ حیات کے ناپاک مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنتے رہے۔ یہ ان لوگوں کی "دینی کاوشوں" کا نتیجہ ہے کہ مسلم ممالک میں اسلامی تہذیب پروان چڑھنے کے بجائے مغربی تہذیب کا تسلط قائم ہوا اور اسلامی افکار و نظریات فروغ پانے کے بجائے ملحدانہ اور کافرانہ خیالات کو کھل کھیلنے کے مواقع فراہم ہوئے۔ سودی کاروبار کی حوصلہ افزائی ہونے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا پورا ڈھانچہ اس طرح تبدیل ہو کر رہ گیا جیسے اسلام کے ساتھ اس کا کوئی دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ یہ سب کچھ بالکل ناگزیر تھا جب آپ یہ اعلان کرتے ہیں کہ سیاست سے آپ کا کوئی تعلق نہیں تو آپ درحقیقت اس بات کا

اعتراف کرتے ہیں کہ باطل نے قوتِ اقتدار کے بل بوتے پر جو نظام قائم کر رکھا ہے وہ آپ کو جوں کا توں قبول ہے۔ اس بنا پر آپ اس اعلان کی روشنی میں جو جدوجہد بھی کریں گے وہ باطل کی تقویت کا باعث ہی ثابت ہوگی۔ اس نتیجے کے علاوہ اگر وہ کوئی دوسرا نتیجہ پیدا کرتی ہے تو یہ بات سخت موجب حیرت ہے۔

ضروری التماس

خریدارانِ ترجمان القرآن و ایجنٹ حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ منی آرڈر کوپن پر اپنا مکمل پتہ ڈاک خانہ، تحصیل و ضلع خوش خط اور واضح الفاظ میں درج ہونا چاہیئے۔ نیز منی آرڈر ارسال کرتے وقت ساتھ ہی بذریعہ خط ترسیل رقم کی اطلاع کر دیا کریں۔ ان امور کی پابندی کے بغیر دفتر کو عدم تعمیل کی شکایت کا ذمہ دار ٹھیرانا درست نہ ہوگا۔

مینجر

تصانیف مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

تفہیم القرآن

کتابت اعلیٰ ۔ طباعت نفیس
جلد ولایتی ریگزین

جلد اوّل سورۃ الفاتحہ ـــــ سورۃ انعام
جلد دوم سورۃ الاعراف ـــــ سورۃ بنی اسرائیل
جلد سوم سورۃ الکہف ـــــ سورۃ الروم
جلد چہارم سورۃ لقمان ـــــ سورۃ الاحقاف
جلد پنجم سورۃ محمد ـــــ سورۃ الطلاق
جلد ششم سورۃ التحریم ـــــ سورۃ الناس

مختلف اجزاء

سورۃ الحجرات ۔ سورۃ الفتح
سورۃ الرحمٰن ۔ سورۃ لقمان
بہترین کتابت ـــــ دلکش طباعت
خوبصورت سہ رنگا کور

خطبات

سفید کاغذ ۔ جمیل سرورق

		روپے
حصہ اوّل	حقیقتِ اسلام	-/۴
حصہ دوم	حقیقتِ صوم وصلوٰۃ	۲/۵۰ ״
حصہ سوم	حقیقتِ زکوٰۃ	-/۲ ״
حصہ چہارم	حقیقتِ حج	۱/۷۵ ״
حصہ پنجم	حقیقتِ جہاد	۱/۲۵ ״

دینیات

سفید کاغذ
سائز ۳۰×۲۰/۱۶
حسین سہ رنگا کور
قیمت :- ۵/۲۵ روپے

خلافت و ملوکیت

سفید کاغذ ۔ خوبصورت سہ رنگا سرورق
سائز ۲۳×۱۸/۸ قیمت -/۱۶ روپے

حقوق الزوجین

سفید کاغذ
سائز ۳۰×۲۰/۱۶
حسین سہ رنگا کور
قیمت :- -/۷ روپے

ادارہ کی مکمل فہرست کتب طلب فرمانے پر مہیا کی جاسکتی ہے

ادارہ ترجمان القرآن ۔ اچھرہ ۔ لاہور